سرما ۱۹۹۰

آج

ترتیب : اجمل کمال

نجیب محفوظ لیوناشستالی

ایلس منرو مظہر علی سید

فہمیدہ ریاض ھارا عباس احمد فواد

محمد خالد اختر اکرام اللہ

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

آج دسمبر ۱۹۸۹

مینیجنگ ایڈیٹر، پبلشر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۲۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

کمپوزنگ

پبلشرز یونائیٹڈ

۸۴ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت

ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار

مکتبۂ دانیال

وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ترتیب

۷
نجیب محفوظ
ملاقات

۱۸
لیو ٹالسٹائی
پیالا

۲۳
کیم مونزو
جہاں گرد

۲۹
مظفر علی سید
اردو ادب کی صورتِ حال

۲۹
فہمیدہ ریاض
زوجین

۴۴
عذرا عباس
نظمیں

۴۹
احمد فواد
نظموں کے منتخب حصے

۶۵
محمد خالد اختر
ہندوستان کی سو سالہ تاریخ ۔

انتخاب
تعارف

۸۱
اکرام اللہ
سوا نیزے پر سورج

درشکر
جہلنت

مصر کے مشہور اور متنازعہ ادیب نجیب محفوظ، جنھیں ۱۹۸۸ میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا، ۱۹۱۱ میں جمالیہ میں پیدا ہوئے۔ جہاں کی خوشبوؤں اور آوازوں نے ان کی بیش تر افسانوی تحریروں کے محلِ وقوع کو ایک حقیقی روپ بخشا۔ انھوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی، لیکن یونیورسٹی کا استاد بننے سے اس بنا پر احتراز کیا کہ وہ اپنی بنیادی شناخت ادیب ہی کو رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی انتظامیہ، وزارتِ مذہبی امور اور وزارتِ ثقافت میں مختلف عہدوں پر خدمات سر انجام دیں اور اپنی فرصت کا تمام تر وقت لکھنے میں صرف کیا۔

۱۹۵۲ کے مصری انقلاب سے پہلے وہ اپنی مشہور trilogy مکمل کر چکے تھے۔ پانچ برس تک انھوں نے کچھ نہ لکھا، جس کی وجہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھی کہ "وہ دنیا جسے بیان کرنا میں نے اپنا وظیفہ بنا لیا تھا، وہ نابید ہو گئی تھی"۔ ۱۹۵۷ میں انھوں نے اپنا سب سے مشہور ناول "جبلاوی کے بیٹے" لکھنا شروع کیا جو قاہرہ کے نیم سرکاری اخبار "الاہرام" میں قسط وار شائع ہوا۔ اس اشاعت نے ایک سخت تنازعے کی شکل اختیار کر لی، اور اخبار کے مدیر کو اس ناول کی اشاعت جاری رکھنے کے لیے صدر ناصر سے اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کرنا پڑا۔ کسی مصری پبلشر کو اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اور یہ ناول پہلی بار ۱۹۶۷ میں لبنان سے شائع ہوا۔

فکشن کی رمزیت اور تہ داری نجیب محفوظ کے فن کی نمایاں خصوصیت ہے، جس کی بنا پر ان کی کہانیاں، جو تبدیلی کے عمل سے دوچار مصری معاشرے کی تصویریں ہیں، ایک آفاقی تناظر اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ خصوصیت نجیب محفوظ کی کہانی "ملاقات" میں بھی موجود ہے، جس کا ترجمہ آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ یہ کہانی ۱۹۶۹ میں شائع ہونے والے مجموعے میں شامل ہے اور اس لحاظ سے نجیب محفوظ کی نمائندہ تحریر ہے کہ اس میں ایک حقیقت نگار بیانیے کی سطح کے نیچے فکشن کی وہی رمزیت اور تہ داری موجود ہے جو ان کے فن کی پہچان ہے۔

اجمل کمال

نجیب محفوظ

ملاقات

وہ بے حس و حرکت اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اپنی آنکھوں، ہونٹوں اور ایک ہاتھ کے سوا بدن کے کسی بھی حصے کو حرکت نہ دے سکتی تھی۔ اپنا ہاتھ بھی بس وہ تھوڑی دیر بعد سینے تک اٹھا سکتی تھی۔ بیماری نے اس میں سے قوت گویا نچوڑ ڈالی تھی۔ اس کا گوشت گھل چکا تھا۔ اس کی زرد کھال جس کی رنگت میں نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی، اس کی باہر نکلتی ہوئی ہڈیوں پر منڈھی رہ گئی تھی۔ وہ یا تو کسی خالی نقطے کو بےمعنی نظروں سے تکتی رہتی یا اپنی آنکھیں بند کیے پڑی رہتی۔ اس کی بینائی، بہت ہوا تو، اس کے کمرے کی چاردیواری تک محدود رہ گئی تھی۔

عیون نے بچے کی سی باریک، کمزور آواز میں پکارا۔

"عدلیہ!"

لیکن عدلیہ کو اس کی آواز سنائی نہ دی۔ کم از کم وہ ظاہر یہی کرے گی کہ اس نے نہیں سنا۔ بہانہ یہ ہو گا کہ عیون کی آواز بہت مدھم تھی یا باورچی خانہ بہت دور ہے یا وہاں چولھے کا شور بہت تھا۔ عیون نہ اپنی آواز کو اس سے زیادہ بلند کر سکتی تھی نہ اسے پکارے بغیر رہنا اس کے لیے ممکن تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔

"عدلیہ!"

عیون کو پھر اسے ملامت کرتے ہوئے خوف محسوس ہو گا۔ وہ عدلیہ کے رحم و کرم پر تھی، مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر۔ وہ عدلیہ کو راضی رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ وہ اسے عمدہ تنخواہ، کپڑے اور کھانا دیتی۔ اس کا گھر عدلیہ ہی سنبھالتی تھی۔ وہ اس گھر کی حقیقی مالکہ بن چکی تھی۔ عیون اس بارے میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ اگر کسی روز عدلیہ اس کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی تو عیون کو ہولناک تنہائی اور موت کی خوراک بن جانا پڑتا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ انتہائی ضرورت کے سوا اس کو ہرگز تکلیف نہ دے،

Scanned with CamScanner

لیکن اس کے بس میں کیا تھا! زندگی کی ضرورتیں تو آخری سانس تک چلتی رہیں گی۔
اس نے اپنی ساتھ چھوڑتی قوّت کو مجتمع کر کے ایک بار پھر پکارا:
"عدلیہ"

غصّہ اس کے بڈھیالے سینے میں اُبھرنے لگا۔ لیکن اس نے اس کے ہیجان میں بہہ جانے سے خود کو روک لیا۔ آخر عدلیہ کو کام بھی تو کتنا کرنا پڑتا ہے! صفائی کرنا، کھانا پکانا اور سودا سلف لانا۔ اس نے عیون کے ہاتھ پیروں اور اس کی مثانے کی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ عیون کے لیے وہ سبھی کچھ تھی؛ وہی کھانے پینے میں اس کی مدد کرتی، اس کا منھ دھلاتی، اسے بٹھاتی اور دوبارہ بستر پر لٹاتی اور اس کی بےچینی دور کرنے کے لیے اسے کروٹ بدلواتی۔

اس نے اپنی شکایت آمیز، حسرتناک آواز کو ذرا سا بلند کیا:
"عدلیہ!"

اسے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی، پھر عدلیہ کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے سہمے چہرے پر ناگواری کی ایک مستقل نقاب تھی۔ اس نے ذرا تیکھی آواز میں پوچھا:
"مجھے بلایا، خالہ؟"
"آواز دے دے کر میرا گلا بیٹھ گیا، عدلیہ۔"
وہ بستر کی طرف بڑھی، اور عیون نے کہا:
"مجھے ایک سگریٹ دو۔"
عدلیہ نے بستر کے سرہانے کی میز پر رکھے ڈبّے میں سے ایک سگریٹ نکالا، اسے سلگایا اور خالہ کے ہونٹوں میں لگا دیا۔ بولی:
"آپ جانتی ہیں سگریٹ پینا آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔"
پھر وہ کمرے سے چلی گئی۔

اگر کسی روز عدلیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو یہ عیون کے لیے سزائے موت کے برابر ہو گا۔ وہ کسی اور پر بھروسا نہ کر سکتی تھی۔ اس کے بھانجے اور بھانجیاں اس کی، اپنی خالہ عیون کی، کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ وہ توجّہ اور یاد گیری سے محروم، زندگی کی باقی ماندہ رمق سے خوف اور مایوسی کے ساتھ چمٹی ہوئی پڑی تھی اور موت کی آرزو مند تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی کے ایک خونریز مظاہرے میں مارے جانے نے اس کے دل کو، بیماری سے بھی پہلے، چور ڈالا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ اس کی اکلوتی اولاد سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی تھی، لیکن اسے سیاست کی کچھ بھی سمجھ نہ تھی اور نہ وہ اس سے ذرا بھی متاثر ہوتی تھی۔ بیٹی کی ہلاکت کے ایک ہی سال بعد اُس کا باپ چل بسا تھا۔ اور اب عیون کے اندوہ کی یادیں اس کی بیماری کی اذیّت اور تنہائی کے ہولناک سایوں میں گھل مل گئی تھیں۔

بُثینہ، اس کی مرحوم بہن کی بیٹی، پچھلی بار عید پر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ ایک پرائمری اسکول کی پرنسپل تھی اور صرف وہی تھی جسے تہواروں کے موقعے پر عیون کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک گلدستہ اور مٹھائی کا ڈبا لے کر آئی تھی۔ وہ بھی اس کے بستر کے قریب ایک

کرسی پر بیٹھی تھی۔ عیون کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولی:
"شکریہ بُثینہ۔ تم کیسی ہو؟ سب لوگ کیسے ہیں؟ تم سب کو دیکھنے کو کتنا دل چاہتا ہے، مگر مجھے پوچھتا ہی کون ہے؟"
بُثینہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائی اور بولی:
"زندگی مصروفیتوں سے بھری پڑی ہے خالہ!"
"تم لوگوں کے سوا میرا کون ہے! آخر مُردوں کو بھی کوئی نہ کوئی یاد رکھتا ہے۔"
"تمھارا مجھے اکثر خیال آتا ہے خالہ۔ مگر کیا کروں، مصروفیتوں سے وقت ہی نہیں ملتا۔"
"سب لوگ مجھے بھول گئے ہیں بُثینہ!"
بُثینہ نے بالآخر خاموشی میں پناہ لی۔ عیون نے کہا:
"میں آخر تم لوگوں کی خالہ ہوں، تمھاری ماں کی واحد بہن جو زندہ رہ گئی ہے۔ اگر عدلیہ مجھے چھوڑ جائے تو میں یہاں پڑی پڑی بھوکی مر جاؤں۔"
اس نے ایک گہری دردناک آہ کی آواز سنی، اور بولتی رہی:
"ہم تینوں بہنیں، تمھاری ماں، بڑی خالہ اور میں، کتنے خوش رہا کرتی تھیں!"
"خدا ان دونوں پر رحمت کرے!"
"میں ان دونوں سے چھوٹی تھی۔ میری خوشیوں کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔"
"خدا کرے تم جلد صحت یاب ہو جاؤ خالہ!"
"تمھاری دعا قبول نہیں ہوگی بُثینہ! میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا ہے۔ میری پنشن بھی میرا پڑوسی لا کر دیتا ہے۔"
اس نے اپنے کمزور نیلے پڑتے ہوئے ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور بولی:
"میں بہت خوف زدہ ہوں بُثینہ! مجھے اس دن سے بہت ڈر لگتا ہے جب عدلیہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"
"ایسا نہیں ہوگا خالہ! اُسے اس جیسا گھر اور کہاں ملے گا؟"
"اسے میرا بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتی ہوں۔"
"تمھارا پورا گھر اور سارے پیسے اس کے قبضے میں ہیں۔ بھلا وہ تمھیں چھوڑ کر کہیں جانے لگی؟"
"پھر بھی میں خوف زدہ ہوں۔ مجھے ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ ہر وقت شک گھیرے رہتا ہے۔ میں اُس سے بھی اتنی ہی خوف زدہ ہوں جتنی اس کے چلے جانے سے۔"
بُثینہ چپ ہو گئی۔ یا تو اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا، یا پھر وہ ایک جیسے گھسے پٹے جملے دہراتے رہنے سے اکتا گئی تھی۔ عیون نے کہا:
"مجھے معاف کر دو بُثینہ! میرے پاس باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ ٹھیک بات نہیں کہ میں تمھیں اپنی فکروں سے مسلسل پریشان کیے جاؤں۔ صرف تمھیں تو ہو جسے میرا خیال رہتا ہے۔"
اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے اپنا شکایتی انداز ترک کر دیا، اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھا:
"اب تم بتاؤ، تمھاری اپنے شوہر سے کیسی نبھ رہی ہے؟"

ثمینہ نے ایک گہری سانس لی اور مختصر سا جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے، تم تو اتنی بے مثال لڑکی ہو؟"

پھر عیون کے خشک، غمناک ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور وہ بولی:

"تم اتنی خوب صورت ہو ثمینہ! لوگ کہتے ہیں تم بس ہو جیسی میں اپنی جوانی میں تھی۔ تم پورے خاندان میں سب سے زیادہ میری ہم شکل ہو۔"

ثمینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ بھی مسکرائی۔

"جب میں گلی میں نکلتی تھی یا دریچے میں کھڑی ہوتی تھی، تو ساری آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔"

ثمینہ ہنسی اور عیون کی طرف درد مندی سے دیکھنے لگی۔

"تم کہتی ہو کہ تمھارے اپنے شوہر سے تعلقات بس ٹھیک ہی ہیں، کیا اسے احساس نہیں کہ خدا نے اسے کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے؟"

"دنیا کا یہی دستور ہے خالہ!"

"لعنت ہو ایسی دنیا پر!"

"دنیا کا کیا بھروسا ہے خالہ!"

عدلیہ کھانے کے برتن اٹھائے داخل ہوئی۔ اس نے عیون کو اٹھا کر تکیے کے سہارے بٹھا دیا اور اسے کھانا کھلانے لگی۔

اس کا دل جیتنے کی کوشش میں عیون نے کہا:

"کھانا بہت اچھا پکا ہے عدلیہ!"

عدلیہ نہ مسکرائی نہ اس کا شکریہ ادا کیا، جیسے اس نے عیون کی بات سنی ہی نہ ہو۔ کمزور اور بےبس شخص کی تعریف بھی بےاثر ہوتی ہے۔

"کیا ہوا ہے عدلیہ؟"

"میں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"خدا اسے خوش رکھے، اسے کیا ہوا؟"

"وہ اپنے مرد کے ہاتھوں بڑی مصیبت میں ہے۔"

"کیوں؟ آخر وہ اپنے سات بچوں کی ماں سے ایسا سلوک کیسے کر سکتا ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتیں، خالہ!"

"تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ اسے کہو کہ صبر سے کام لے۔"

"اگر اسے طلاق ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟"

ہاں واقعی، پھر کیا ہو گا؟ اگر عدلیہ اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کو اس گھر میں لے آئی تو؟ عیون اس پر اعتراض بھی کیسے کر سکتی ہے! وہ تو پوری طرح عدلیہ کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ مکان اتنا کشادہ نہیں، اس پورے خاندان کے آ جانے سے تو بالکل بازار بن کر رہ جائے گا۔ اتنی شور و غل اور ہنگامے میں اس کا کیا حشر ہو گا؟ اور پھر ان سب کے کھانے اور کپڑے کا خرچ وہ کیسے برداشت کر سکے گی؟

یہ تمھارے لیے ایک نئی تشویش ہے عیون! شیخ طہ نے تمھاری شادی پر تمھیں دعا دیتے ہوئے کہا تھا "خدا تمھیں عزت دے اور تمھاری قسمت اچھی ہو۔" تمھاری ماں تم پر کس قدر ناز کرتی تھی! تمھاری شادی شدہ زندگی کتنے خوشگوار انداز سے شروع ہوئی تھی۔ تمھارا شوہر ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والا جج تھا۔ اس نے تمھیں ایک روز کوسموگراف سنیما کے باکس میں دیکھ لیا تھا اور تم پر مر مٹا تھا۔ تم ایک محبوب بیوی اور ایک مسرور ماں تھیں۔ تمھارا شوہر، تمھارے حسن پر نازاں، تمھارا ہاتھ تھام کر یورپ لے جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک بار جب ایک پاشا نے تم سے بےتکلف ہونے کی کوشش کی تو فساد ہوتے ہوتے بچا تھا۔ لیکن تمھاری زندگی کی کہانی کا انجام یہ ہے یہ بستر مرگ، جہاں تم اس بےحس اور حقیر عورت کے رحم و کرم پر پڑی ہو جو تمھیں ایک مسکراہٹ تک سے محروم رکھتی ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ عیون کی آنکھیں امید سے جھلملائیں، کیا کوئی ملنے آیا ہے؟

"کون ہے، عدلیہ؟"

"پلمبر آیا ہے، خالہ!"

پھر وہی پلمبر! یہ ہمیشہ یہیں موجود رہتا ہے! باورچی خانے یا غسل خانے یا کسی پائپ کی مرمت کے لیے آیا ہو گا۔ نتائج سے خوف زدہ ہو کر وہ کبھی عدلیہ سے پوچھنے تک کی جسارت نہ کرتی تھی، اعتراض کا تو سوال ہی کیا تھا۔ پلمبر جب اس کی مرضی ہوتی یا جب وہ مزاجاً اسے بلا بھیجتی، آ موجود ہوتا۔

عدلیہ نے عیون کے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تاکہ وہ پلمبر کو نہ دیکھ سکے۔ عیون کو بہت دنوں سے اس پر شک تھا، مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟ اس کے گھر میں یہ سب کچھ ہوتا، اس کے کمرے کے دروازے کے باہر، جیسے اس کی اجازت کے بغیر، بلکہ اس کی مرضی کے خلاف، بند کر دیا جاتا اور یہ سب اس کے غلط کے نام پر! وہ بےبس اور مجبور تھی۔ اگر اس شخص کو اس سے زیادہ کا لالچ ہوتا، یا وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ محسوس کرتا، اگر کوئی شیطانی خیال اس کے ذہن میں آ جاتا، تو عیون کی حفاظت کون کر سکتا تھا؟ وہ کان لگا کر غور سے سننے لگی۔ وہ بےحد مضطرب تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے مرحوم بیٹے کو بھی اس بےرحم صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے ایسی ہی بےبسی محسوس ہوتی ہو گی جس نے اسے عالم شباب میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ لیکن وہ تو نیم مردہ اور بستر کی قیدی تھی۔

عدلیہ نے دروازہ کھول دیا، اور بولی:

"چلا گیا۔"

کیا اس نے ضرورت سے زیادہ وقت نہیں لگایا؟ اس کا ذکر کیے بغیر عیون نے پوچھا:

"کیا کیا اس نے؟"

"باورچی خانے کا پائپ ٹھیک کرنا تھا۔"

اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

Scanned with CamScanner

"لیکن باورچی خانے کا پائپ تو۔"
عدلیہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی!
"بہت پرانا ہو گیا ہے۔ بار بار مرمت کرنی پڑتی ہے۔"

ہاں اس کی بار بار مرمت کرنی پڑتی ہے، چاہیے اس کی جگہ نیا پائپ ہی کیوں نہ لگا دیا جائے۔ پلمبر کی آمدورفت کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ٹھیک ہے۔ آیا کرے۔ جب اس کی مرضی ہو، یا جب عدلیہ چاہے۔ اسے تو اس صورتِ حال کو برداشت کرنا ہی ہو گا، کیونکہ اس کی آنکھیں، ہاتھ پیروں اور تمام حسیات کی جگہ اب تو عدلیہ ہی نے تو سنبھال رکھی ہے۔ اس گھر میں عدلیہ کا کام بھی تو سخت اور تھکا دینے والا ہے۔ پھر بھی یہ صورتِ حال عیون کی برداشت سے باہر رہے گی، اور اس کا نتیجہ بےخوابی کی شکل میں نکلتا رہے گا۔

تب ایک دن، ایک اجنبی نے دروازے پر دستک دی۔ عدلیہ نے آکر اسے بتایا،
"خانم، ایک اندھا آدمی آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پرانے دنوں میں آپ اسے جانتی تھیں۔"
اس کے مزید بولنے سے پہلے ہی، باہر اجنبی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی دی،
"شیخ طٰہٰ الشریف، خانم عیون؟"

یہ آواز! یہ نام! اس نے اپنی دم توڑتی ہوئی یادداشت کو مدد کے لیے پکارا۔ اس کا دل بےقراری سے چونک اٹھا۔ پھر یادوں نے تازہ معطر ہوا کے جھونکوں کی طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شادمانی کی ایک لہر سی اس کے وجود میں دوڑ گئی۔
"آئیے! جانتی، شیخ طٰہٰ! عدلیہ! انھیں یہاں لے آؤ۔"

وہ عدلیہ کے سہارے، چھڑی کے سرے سے راستہ ٹٹولتا ہوا اس کے بستر کے پاس آیا۔ اس کا عمامہ ڈھیلا ہو کر کھل گیا تھا اور اس کی بلند پیشانی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی پشت کہن سالی سے جھکی ہوئی تھی۔ اس کی اترے ہوئے رنگ والی پھٹی پرانی جبا نے اس کے ضعیف جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جب اسے عیون کے سرہانے بٹھا دیا گیا تو وہ اس سے مخاطب ہوئی،
"یہ رہا میرا ہاتھ، شیخ طٰہٰ، لیکن اسے زور سے مت دبانا، یہ بہت کمزور ہے۔"
اس نے نہایت نرمی اور شفقت سے مصافحہ کیا، اور کہا،
"خدا تمھیں جلد شفایاب کرے، خانم عیون!"
"خدا کا شکر ہے جس نے پھر تمھاری صورت دکھائی۔ پچھلی بار ہماری ملاقات کب ہوئی تھی؟"
اس نے اپنا سر تاسف سے ہلایا، اور بولا،
"کتنا زمانہ گزر گیا!"
"وہ کتنے اچھے دن تھے، شیخ طٰہٰ!"
"خدا تمھیں ہمیشہ اچھے دن دیکھنا نصیب کرے!"
"مگر کیسے؟ میں تو یہاں بسترِ مرگ پر پڑی ہوں۔ اور تنہا ہوں۔"
اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، اور بولا،

"وہ رحم کرنے والا ہے۔"
"تمھیں میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"
"اس پرانی حویلی کے چوکیدار سے ملا تھا، چچا ادہم سے۔"

عیون ماند آنکھوں سے اس کے عمر رسیدہ چہرے کی جھریوں کو تکتی رہی، اور وہ حسرت اور بدحالی کا نشان بنا بیٹھا رہا۔ جب وہ پرانی حویلی میں قاری کے طور پر ملازمت کرتا تھا، ان دنوں میں وہ کتنا مضبوط اور طاقت ور ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر روز فجر کے بعد ان کے گھر آکر قہوہ پیتا، قرآن کی تلاوت کرتا اور مذہبی مسائل پر عیون کی والدہ کی راہ نمائی کرتا۔ اسی نے عیون کی شادی کے روز اسے دعا دیتے ہوئے کہا تھا، "خدا تمھیں عزت دے اور تمھاری قسمت اچھی ہو۔" ماضی کے دھندلے گوشوں سے ایک پُرمہر تمثال یادوں اور آنسوؤں کی لہروں پر گویا امڈا چلا آ تھا۔

اس نے اپنی ساخوردہ جوتی اتار دی، کرسی پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔

جب وہ قہوہ پی چکا اور کمرے میں صرف وہ دونوں رہ گئے تو عیون نے کہا،
"میں اکیلی ہو گئی ہوں، شیخ طٰہٰ!"
وہ گویا احتجاج کرتے ہوئے بولا،
"لیکن خدا تمھارے ساتھ ہے، خانم عیون!"
"میں ہر وقت فکرمند اور خوفزدہ رہتی ہوں۔"
"خدا پر بھروسا رکھو، خانم عیون!"
"کاش تم مجھے روز ملنے آ سکتے!"

"میں بہت خوشی سے روز آؤں گا!"
"تمھارے معاملات کیسے چل رہے ہیں شیخ طٰہٰ؟"
"خدا کی یہی مرضی تھی کہ تلاوت کی ریکارڈوں کی وجہ سے ہم بےروزگار ہو جائیں، لیکن ... خدا اپنے غلام کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ اس وقت تو سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم ... اور مایوسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالو۔"
"مجھے تشویش ہے شیخ طٰہٰ! عدلیہ کے سوا میرے پاس کوئی بھی نہیں۔ اگر وہ مجھے چھوڑ دے۔"

"لیکن خدا تمھارے ساتھ ہے، خانم عیون!"
"مگر میں تنہا ہوں۔"
اس نے ناراضی سے اپنے ہاتھ کو گردش دی، اور بولا،
"کتنے افسوس کی بات ہے!"
"کیا میں نے غلط کہا، شیخ طٰہٰ؟"
"نہیں، لیکن تمھارا خدا پر ایمان نہیں رہا۔"

Scanned with CamScanner

"میرا ایمان ہے! میرا بیٹا اور میرا شوہر باری باری مجھ سے بچھڑ گئے۔ پھر بھی میرا ایمان ہے۔"
"نہیں تمہارا ایمان نہیں رہا، خانم عیون؟"
وہ ناخوش ہو کر خاموش ہو رہی۔ شیخ طٰہ نے کہا:
"تارا ہی نہ ہوا جیسی کا ایمان ہو اس کے دل میں تشویش، خوف اور مایوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔"
"میرا ایمان ہے، لیکن میں بسترِ مرگ پر ہوں اور عدلیہ کے رحم و کرم پر ہوں۔"
"ایمان والے صرف خدا کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، کسی اور کے نہیں۔"
"اس کی تبلیغ کرنا کتنا آسان ہے، اور اس پر عمل کرنا کتنا مشکل؟"
شیخ طٰہ نے تاسف سے سر ہلایا اور کہا:
"ہاں، تبلیغ کرنا کتنا آسان ہے اور عمل کرنا کتنا مشکل؟"
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"
"میں روز تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔"
"ضرور، خدا کے لیے، شیخ طٰہ!"
"مگر تمہیں ایمان کی ضرورت ہے۔ ورنہ ایک بوڑھا اندھا آدمی تمہاری کیا مدد کر سکتا ہے۔"
اس نے کچھ توقف کیا، پھر جھجکتی ہوئی بولی:
"لیکن شاید اسے ناگوار گزرے، عدلیہ کو؟"
"میں پھر بھی آؤں گا۔"
"لیکن اگر — فرض کرو —"
"یقین رکھو، میں روز تمہارے پاس آؤں گا۔ اگر اسے برا لگتا ہے تو بے شک دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے۔"
عیون گھبرا کر دبی آواز میں بولی:
"آہستہ بولو شیخ طٰہ! ہمیں اس کو غصہ نہیں دلانا چاہیے۔"
"خانم عیون، بھول جاؤ کہ تم اس کے رحم و کرم پر ہو۔ تم صرف خدا کے رحم و کرم پر ہو!"
"ہاں، ہاں۔ ہم سب خدا کے رحم و کرم پر ہیں۔ لیکن سوچو تو سہی اگر اسے غصہ آ گیا تو میرا کیا ہو گا۔"
"کچھ نہیں ہو گا! خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔"
"یہ سچ ہے شیخ طٰہ لیکن میری شہرت کا خیال کرو، اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی —"
"وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی خانم عیون۔ کیونکہ وہ تمہاری اس سے زیادہ محتاج ہے جتنی تم اس کی محتاج ہو۔"
"میں تو ضعیف ہوں، اس میں طاقت ہے۔ اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے۔"
"ہاں اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے، لیکن ملازمہ کے طور پر! یہاں تو وہ مالکن بنی بیٹھی ہے۔"

شاید تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بالکل بے یار و مددگار ہوں۔"
اس نے اپنا عصا زمین پر مارا، اور کہا:
"تمہاری آدھی بیماری تو اس پر انحصار کی وجہ سے ہے۔"
"لیکن میری بیماری ایک حقیقت ہے۔ ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے۔"
"میں بیماری اور ڈاکٹروں پر یقین نہیں رکھتا، پھر بھی میں فی الحال تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ خانم عیون، فرض کرو وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی، جیسا کہ تمہیں اندیشہ ہے، تو میں اپنی بڑی بیٹی کو تمہارے پاس رہنے کے لیے لے آؤں گا۔ اسے طلاق ہو چکی ہے۔"
اس کی دھندلی آنکھوں میں ایک طرح کی روشنی سی چمکی۔ اس نے بیتابی سے پوچھا:
"واقعی، شیخ طٰہ؟"
"ہاں، کیوں نہیں؟ تمہاری خاطر میں اس کے بغیر رہ لوں گا۔"
اس نے شرمندہ ہو کر جواب دیا:
"لیکن تم تنہا کیسے رہو گے؟"
وہ پہلی بار ہنسا، اور بولا:
"ہاں، ایک بوڑھا اندھا آدمی اکیلا کیسے رہے گا؟ آخر اس کی طلاق سے پہلے میں اکیلا رہتا ہی تھا۔"
"میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔"
"تم صرف خود پر بوجھ بنی ہوئی ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔"
خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جو سکون اور آسودگی سے معمور تھا۔
اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔
اب اس کے جانے کا وقت تھا۔ اس نے نرمی سے سر ہلا کر خدا حافظ کہا، اور چلا گیا۔
عیون کو ایک طویل عرصے کے بعد ایک تسکین کا احساس ہوا۔ اس نے عدلیہ کو بلایا اور اس سے کہا:
"عدلیہ! دیکھو، شیخ طٰہ جب بھی آئیں تو ان کا احترام اور عزت سے استقبال کرنا۔"
ناگواری سے عدلیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ تنک مزاجی سے بولی:
"مگر خانم عیون، وہ بہت غلیظ ہے!"
"وہ ہماری پرانی حویلی کا قاری ہے۔ اس کی رفاقت مجھے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔"
"خانم، میں نے اس کے ماتھے پر جوئیں چلتی دیکھی تھیں۔"
عیون طیش میں آ گئی:
"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں! وہ بہرحال بزرگ آدمی ہے۔"
عدلیہ دھمکاتی والے لہجے میں بولی:
"لیکن میرے ذمے پہلے ہی اتنا کام ہے۔"
عیون کی آواز میں جھنجھلاہٹ آ گئی:

Scanned with CamScanner

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو، یہ میری خواہش ہے اور میں تم سے اس کے احترام کی توقع رکھتی ہوں۔"

"لیکن میں نے خود دیکھا کہ —"

عیون اس کی بات کاٹ کر سختی سے بولی:

"وہ بزرگ آدمی ہے اور تمھیں میرا حکم ماننا ہو گا۔"

عدلیہ کا چہرہ تن گیا، وہ کچھ کہنے کو تھی، لیکن عیون کی تاکید نے اسے باز رکھا۔

"جو تم سے کہا جائے، وہ کرو، بحث مت کرو۔"

عدلیہ کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ اس نے چونک کر تعجب سے عیون کو دیکھا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ لیکن عیون نے عدلیہ کی تیز نظروں سے ہار نہ مانی، وہ پُرعزم انداز میں اسے جواباً گھورتی رہی۔ اس نے اپنی بیماری اور خوف کی کوئی پروا نہ کی۔ اسے اپنے وجود کی اندرونی تہوں میں جیت کی پُرحرارت لرزش محسوس ہونے لگی۔

عدلیہ نے بالآخر اپنی آنکھیں جھکا لیں، اور منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر عیون نے معاملے کو یہیں ختم نہیں کیا۔ وہ پوری طرح مطمئن اور پُراعتماد ہونا چاہتی تھی۔ اس نے عدلیہ کو دوبارہ آواز دی۔ عدلیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناگواری اور بےصبری سے کہا:

"کیا بات ہے؟ چولھے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے۔"

عیون نے مضبوط لہجے میں اس سے پوچھا:

"مجھے بتاؤ تم شیخ طٰہٰ کا کیسے استقبال کرو گی؟"

"کون شیخ طٰہٰ؟"

عیون طیش میں آ کر چلائی:

"کیا! تم مجھ سے مذاق کرتی ہو، عدلیہ؟"

"آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے ہی تو پوچھا ہے کہ شیخ طٰہٰ کون ہے؟"

"کیا تم شیخ طٰہٰ کو نہیں جانتیں؟"

"میں نے اس کا نام بھی کبھی نہیں سنا۔"

عیون نے جدّوجہد جاری رکھنے کے عزم کے ساتھ جواب دیا:

"وہی بوڑھا قاری جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بیٹھا تھا، جسے تم نے خود قہوہ پیش کیا تھا؟"

عدلیہ نے شک اور تشویش سے اس کے چہرے کو دیکھا، اور بولی:

"آج تو گھر میں کوئی بھی نہیں آیا، نہ کوئی قاری نہ عیادت دار۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

غصّے سے عیون کی آواز رُندھ گئی:

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم اتنی گستاخ ہو گئی ہو —"

"مجھے آپ کی باتوں سے خوف آ رہا ہے۔ شیخ طٰہٰ کون ہے؟"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو یا مجھے پاگل کر دینا چاہتی ہو؟"

بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ عدلیہ نے جواب دیا:

"اپنی بیٹی کی جان کی قسم، میں نے نہ کبھی شیخ طٰہٰ کو دیکھا نہ اس کا نام سنا۔"

عیون کی آواز اتنی بلند ہو گئی جتنی کئی سال سے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چلّا کر کہا:

"اب تم قسم تک کھا رہی ہو! تم میرے خلاف سازش کر رہی ہو۔ تم مجھے باور کرانا چاہتی ہو کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آ رہی ہیں جن کا وجود نہیں، کہ میں پاگل ہوں۔ یہی چاہتی ہو نا؟ یہی چاہتی ہو نا کہ میں اپنے آخری دوست سے بھی محروم ہو جاؤں؟"

عدلیہ کی آنکھیں مارے خوف کے پھٹنے لگیں۔ اس کی تنک مزاجی ڈھیر ہو گئی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں چلائی:

"خانم عیون، آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں؟"

"خاموش رہو! میں تم سے نہیں ڈرتی۔ میں تمھاری محتاج نہیں ہوں۔ وہ یہاں روز میرے پاس آیا کرے گا۔ یہ میرا حکم ہے اور تمھیں اس کو بحث کیے بغیر ماننا ہو گا۔ خبردار جو اس کا راستا روکنے کی کوشش کی! میں تمھیں گھر سے نکال دوں گی۔"

عدلیہ کا رنگ زرد ہو گیا اور آنکھیں اُبل پڑیں۔ اس نے عاجزی سے کہا:

"خانم، خود کو تھکائیے مت۔ اپنے ذہن کو سکون سے رکھیے۔ میں بہت خوشی سے آپ کا حکم مانوں گی۔"

لیکن عیون چلاتی رہی:

"جھوٹی! کمینی! چور! زانیہ! میں اتنے سال سے تجھے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔ میں تیرا منحوس چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرے بغیر تیری قیمت دو کوڑی بھی نہیں۔ مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں۔ نکل جا! جہنّم میں جا! خدا کی نعمتوں نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تجھے شکر ادا کرنا چاہیے تھا، مگر تُو دن رات مجھے ذلیل کرتی رہی، ڈراتی رہی، اذیت دیتی رہی۔ نکل جا! آج کے بعد اپنی شکل مت دکھانا۔ خدا تجھے غارت کرے۔"

عدلیہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ دہشت نے اسے نرغے میں لے کر گویا اس کے دماغ کو نچوڑ ڈالا تھا۔ اچانک وہ پلٹی، اِدھر اُدھر دیکھا اور زور زور سے چلاتی ہوئی تیز ہوا کی طرح دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

(عربی)

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

لیو ٹالسٹائی

پیالا

"الیوشا" چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ اسے سب الیوشا ہی پکارتے تھے۔ لیکن ایک دن یوں ہوا کہ اس کی ماں نے اسے کسی مشنری کے گھر دودھ پہنچانے بھیجا تو وہ راہ میں ٹھوکر کھا کر سنبھل نہیں سکا اور ٹوٹے ہوئے پیالے کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ اس دن الیوشا کو گھر میں مار پڑی اور جب وہ باہر نکلا تو اسے گلی کے بچّوں نے چھیڑنا شروع کر دیا۔ "پیالا! پیالا!! الیوشا پیالا!" اس دن سے الیوشا کا نام پیالا پڑ گیا۔

الیوشا کے کان اس کے چہرے کی بہ نسبت بڑے تھے۔ ایسے بڑے کان کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی بڑا پرندہ پر پھیلائے اس کے کاندھوں پر آ بیٹھا ہو۔ گاؤں میں ایک اسکول موجود تھا لیکن پڑھ نہ سکا۔ الیوشا کے لیے مشکل کام ثابت ہوا اور پھر اس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ اس کا بڑا بھائی شہر میں ایک تاجر کے گھر ملازم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن سے الیوشا نے چلنا شروع کیا، اسی دن سے گھر کا کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کی تمام بکریوں کا رکھوالا بن گیا۔ اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گھوڑوں کی دن رات نگہداشت پر مامور کر دیا گیا۔ بارہ برس کا ہوتے ہی وہ کھیتوں میں ہل چلانے اور گھوڑا گاڑی پر شہر تک سامان لانے کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت تازگی اور شگفتگی رہتی۔ محلے کے بچے اس پر ہنستے مگر وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہتا یا خود بھی ہنسنے لگتا۔ اس کا باپ ذرا خفا ہوتا تو وہ سر جھکا کر اس کی ڈانٹ سنتا اور جب باپ کے دل کی بھڑاس نکل جاتی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ادھورے کام کی طرف پلٹ جاتا۔

جب الیوشا انیس سال کا ہوا تو اس کے بڑے بھائی کو جبری بھرتی والے لے گئے۔ الیوشا کو بتایا گیا کہ اب اسے شہر جا کر اپنے بھائی کی جگہ ملازمت کرنی ہو گی۔ دوسرے دن اسے بڑے بھائی کے پرانے جوتے پہنائے گئے اور شہر لے جا کر تاجر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ تاجر کو الیوشا کی نرم طبیعت اور نازک ہاتھ پاؤں کام کے لیے ناموزوں معلوم ہوئے۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ سائمن کی جگہ مجھے جو ملے گا وہ سائمن جیسا ہی ہوگا۔" تاجر نے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے کس کام کا ہے؟"

"یہ ہر کام کر سکتا ہے۔" الیوشا کا باپ فخر سے بولا۔ "اس لڑکوں کی جگہ یہ کھلا کافی ہے۔ کمزور لگتا ہے، لیکن آپ اسے تھکا نہیں سکتے۔"

"خیر یہ تو معلوم ہو جائے گا۔" تاجر نے ایک مرتبہ پھر الیوشا کو غور سے دیکھا۔

"نہ اور پلٹ کر جواب دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ اس کا بس چلے تو ساری زندگی کھائے پیئے بغیر کام کرتا رہے۔"

"ٹھیک ہی ہے، چھوڑ جاؤ۔" تاجر نے بیزاری سے کہا۔

یہ الیوشا کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

تاجر کا خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ [illegible] ایک مذہبی سرگرمیوں میں [illegible] اور دوسرا دنیاوی معاملات میں [illegible] بیٹی تھی جو ہائی اسکول کے آخری درجے میں تھی۔

ابتدا میں الیوشا کسی کو پسند نہیں آیا۔ وہ کسان زادہ تھا، اور انھیں اب تک اس کا وجود کھٹکتا [illegible] گھر والے الیوشا کے عادی ہو گئے۔ بالآخر اس کی محنتی طبیعت نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ کسی کام [illegible] کام ختم کرنے کے بعد بغیر دم لیے دوسرا کام شروع کر دیتا [illegible] سارا کام الیوشا کے سپرد ہو گیا [illegible] کے فرائض میں اضافہ ہوتا گیا۔ [illegible] تاجر کی بیوی اور اس کی ماں [illegible] نظر آتا۔

اسے تمام دن اسی طرح کے جملے سنائی دیتے:

"الیوشا، دوڑ کر جاؤ اور اسے بھی لے آؤ!"

"ذرا اس کا خیال رکھنا الیوشا۔"

"واپسی پر اس کی طرف سے بھی ہوتے آنا، اور"

"یاد رکھنا کہ تم بھول گئے تھے۔"

"ہاں! ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔"

الیوشا سب کی سنتا، یاد رکھتا، مسکراتا رہتا اور ایک کے بعد دوسرا کام کرتا چلا جاتا۔

کچھ عرصے بعد الیوشا کے اونچے جوتے ادھڑنے لگے اور جگہ جگہ سے اس کی انگلیاں اور پنجوں کی کھال جھانکنے لگی۔ تاجر نے اسے جوتوں کے [illegible]

الیوشا کا چہرہ جگمگانے لگا۔ مگر نئے جوتوں نے اس کے پیروں کو فوراً لہولہان کر دیا اور شام تک وہ جوتوں کے کاٹنے سے پریشان ہو گیا۔ اس پر طرفہ یہ تھا کہ نئے جوتوں کی قیمت اس کی تنخواہ سے کاٹ لی جانی تھی اور جب اس کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرنے آئے گا تو اس پر بہت خفا ہو گا۔ کچھ عرصے سے اس کا باپ اسے مسلسل تنبیہ کر رہا تھا کہ وہ اپنی جوتی بہت تیزی سے گھس رہا ہے اور اس سلسلے میں اسے احتیاط برتنی چاہیے۔

الیوشا منہ اندھیرے اٹھ کر انگیٹھی کے لیے لکڑیاں تراشتا، صحن اور بیرونی احاطے کی صفائی کرتا، گھوڑوں کا راتب اور گایوں کا چارہ تیار کرتا، چولہا گرم کرتا، گھر بھر کے جوتے چمکاتا، مالک کے کپڑے جھاڑ کر دھوپ میں پھیلاتا، دریاں اور فرنیچر پونچھتا۔ پھر وہ خانساماں کے کہنے پر سودا لینے بازار کا رخ کرتا یا خادمہ کی ہدایت پر برتن دھونے لگتا۔ اس سے فارغ ہوتا تو اسے کسی کے نام کی چٹھی دے کر شہر کے دوسرے حصے میں بھیجا جاتا اور واپسی پر چھوٹی بچی کو اسکول سے لانے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی پکارتا "الیوشا! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ فاصلہ تو نہیں تھا۔ جلد از جلد جاؤ اور —" اور الیوشا فوراً جاتا اور تن دہی سے نئے کام میں مصروف ہو جاتا۔

فرصت کا لمحہ ملتا تو وہ روٹی پر سالن ڈال کر کھانے لگتا۔ لیکن اسی دوران کوئی کام آ پڑتا تو وہ روٹی کو کوڑے کی ٹوکری میں ڈال کر ہدف کی طرف دوڑ پڑتا۔ خادمہ اسے کھانے کے وقت پر نہ پہنچنے پر ڈانٹتی، لیکن اس کی مجبوری پر رحم کھا کر وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھ لیتی تھی۔

الیوشا زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ جب اسے بات کرنی ہی پڑتی تو وہ جملوں کی جگہ محض الفاظ بول کر اپنا مدعا بیان کرتا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا وہ فلاں فلاں کام کر سکتا ہے؟ "کیوں نہیں؟" وہ جواب دیتا اور مخاطب کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی کام شروع کر دیتا تھا۔

اسے کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ بچپن میں اس کی ماں نے اسے چند دعائیں یاد کرائی تھیں جو وہ وقت گزرنے کے ساتھ بھول گیا تھا۔

اس طرح الیوشا نے دو برس گزار دیے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جو اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ سمجھتا تھا کہ ہر آدمی کو دوسرے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی سطح پر سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اس لیے سب میں انسانوں کے انسانوں سے تعلقات قائم ہیں۔ لیکن یہ بات الیوشا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی صورت حال ایسی بھی ہوتی ہے جب آدمی یہ چاہتا ہو کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ رہے جبکہ اسے دوسرے سے کوئی کام نہیں لینا ہوتا۔

انسانوں کے درمیان ایسا بھی تعلق ہو سکتا ہے یہ الیوشا کے لیے انکشاف تھا، اور یہ بات اس پر منکشف ہوئی تھی۔ ثانیا اس کی ہم عمر ایک یتیم لڑکی کا نام تھا جو تاجر کے گھر خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وہ بھی الیوشا کی طرح سخت محنتی طبیعت کی تھی اور اسے الیوشا کی بے غرضی پر پیار سا آتا تھا۔ اسے دیکھ کر الیوشا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اس کے کام کی نہیں بلکہ خود اس کی ضرورت ہے۔ بچپن میں جب

الیوشا کی ماں اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی تھی تو وہ حیران نہیں ہوتا تھا، وہ جانتا تھا کہ تمام مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔ لیکن ثانیا نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس کا الیوشا سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اس کے لیے مکھن لگی روٹی بچا کر رکھتی تھی۔ الیوشا جب روٹی کھاتا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس دوران الیوشا کی نظریں اس سے ملتیں تو وہ بے ساختہ ہنس پڑتی۔ یک لخت الیوشا جھینپ جاتا اور پھر خود بھی ہنسنے لگتا۔

یہ صورت حال اتنی انوکھی اور پرکیف تھی کہ ابتدا میں الیوشا خوف زدہ سا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ پہلے جیسی مستعدی اور تیزی سے کام نہیں کر سکے گا۔ ثانیا نے اس کی زندگی میں وہ دریچہ کھول دیا تھا جہاں سے اس نے پہلی بار پھول اور تتلیاں دیکھی تھیں۔ اس سے پہلے بھی اسے یہ چیزیں کہیں نہ کہیں نظر آتی رہی تھیں۔ لیکن فرصت نہ ہونے کے باعث وہ انہیں کبھی صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا۔ کام کے دوران جب اس کی نظر اپنے جوتوں کے ان حصوں پر پڑتی جو ثانیا نے انتہائی مہارت سے رفو کیے ہوتے تو وہ بے اختیار کہتا، "شکریہ ثانیا! شکریہ! شکریہ!"

جب بھی میسر ہوتا دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے، باتیں کرتے، ہنستے اور بچپن کے واقعات دہراتے۔ ثانیا کو باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اس نے الیوشا کو بتایا کہ کس طرح اس نے بچپن میں اپنے والدین کو یکے بعد دیگرے مرتے دیکھا اور پھر کس طرح وہ اپنی خالہ کے پاس پہنچ گئی۔ الیوشا نے سن رکھا تھا کہ گاؤں سے کام کی تلاش میں شہر آنے والے اکثر لڑکے گھریلو خادماؤں سے شادی کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ثانیا نے الیوشا سے پوچھا کہ اس کا باپ اس کی شادی کے بارے میں کیا ارادہ رکھتا ہے۔ "معلوم نہیں۔" الیوشا نے کندھے اچکا کر جواب دیا "بہرحال گاؤں کی لڑکی سے تو شادی مشکل ہے۔"

"تو تم کسی کو پسند کرتے ہو؟" ثانیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے شادی کروں گا۔" الیوشا نے کسانوں کی پیدائشی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تم کرو گی؟"

"لو اور سنو۔ پگلا مجھ سے شادی کرے گا۔" یہ کہہ کر ثانیا اس کی سادہ لوحی اور بیباکی پر ہنسنے لگی۔ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر بولی، "کیوں نہیں، الیوشا! کیوں نہیں۔"

ایک ہفتے بعد الیوشا کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرنے شہر آیا۔ تاجر کی بیوی تک خبر پہنچ چکی تھی کہ الیوشا پر ثانیا سے شادی کرنے کی دھن سوار ہے۔ اس نے اپنے خاوند کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا "شادی کے بعد کوئی لڑکی اتنی محنت نہیں کر سکتی۔ بچوں کے ساتھ ثانیا ہمارے لیے بیکار ہو جائے گی۔"

تاجر نے الیوشا کی تنخواہ اس کے باپ کی جانب بڑھائی تو وہ ہمیشہ کی طرح کھل اٹھا۔ "میرا بیٹا کیسا کام کر رہا ہے؟ انکار کرنا تو وہ جانتا ہی نہیں۔"

"جہاں تک کام کا تعلق ہے۔" تاجر سنجیدہ لہجے میں بولا "مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مگر وہ ہماری خادمہ سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہے یہ ہمارے لیے سود مند نہیں ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

"آخر اس کی یہ جرأت؟" الیوشا کے باپ نے حیرت سے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پرسکون انداز میں بولا، "آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں یہ معاملہ ختم کر کے جاؤں گا۔"

جب الیوشا کوڑا کرکٹ اٹھا کر پھولا ہوا سانس لیے سامنے آیا تو اس کا باپ اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"میں تمہیں سمجھدار اور سعادت مند بیٹا سمجھتا تھا لیکن — یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں — یہ کہ — کچھ بھی نہیں۔"

"کیا کچھ بھی نہیں؟ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔ جب وقت آئے گا میں خود تمہاری شادی کر دوں گا — کام کی عورت سے۔ شہر کی مکار عورتوں سے دور رہو۔ سمجھے؟"

اس کا باپ دیر تک اسے کڑے لہجے میں نصیحتیں کرتا رہا اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جب باپ خاموش ہو گیا تو الیوشا کے چہرے پر وہی تبسم پھیل گیا۔

"تو پھر؟" باپ کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔ "میں یہ معاملہ ختم سمجھوں؟"

"جی ہاں۔" الیوشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب اس کا باپ رخصت ہو گیا تو تانیا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سنتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"ہمیں یہ معاملہ ختم سمجھنا چاہیے۔" الیوشا نے نرمی سے کہا۔

تانیا نے ہلکی ہچکیاں لیں تو دو آنسو اس کے رخساروں پر واضح لکیریں بنا گئے۔

الیوشا نے نظر بھر کر تانیا کو دیکھا۔ گہری سانس لی اور مدھم آواز میں کہا، "کیا کریں — سب ناراض ہو رہے ہیں — بھولنا ہی پڑے گا۔"

رات کو سونے سے قبل گھر کی کھڑکیاں بند کرنے کے دوران جب وہ بڑے خواب گاہ میں داخل ہوا تو تاجر کی بیوی اسے دیکھتے ہی بولی، "باپ سے ملاقات ہو گئی؟ اب سب کچھ بھول کر کام میں دل لگاؤ؟"

"لگتا ہے بھولنا ہی پڑے گا۔" الیوشا نے مسکرا کر کہا اور اچانک دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگا۔

اس دن کے بعد الیوشا نے کبھی شادی کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کام میں مصروف رہنے لگا تھا۔

سردیوں کی ایک صبح اسے چھت سے برف صاف کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ برف کے ڈھیر ہٹا کر سیڑھی دھکیلنے لگا اور کچھ ہی دیر میں اس نے پوری چھت صاف کر دی۔ اس کے بعد وہ روشن دانوں کے چھجوں پر جمی برف صاف کرنے کے لیے جھک رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آ گرا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ تو برف کے ڈھیر میں دھنستا گیا، لیکن اس کا سر آہنی جنگلے سے ٹکرا گیا۔ گرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا، مگر فوراً ہی لڑکھڑا کر دوبارہ برف پر لیٹ گیا۔ تاجر کی بیوی اور تانیا دوڑی چلی آئیں۔ "الیوشا تم ٹھیک ہو؟ تمہیں چوٹ لگی ہے؟" دونوں گھبرا رہی تھیں۔

"ہاں ذرا چوٹ لگ گئی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "لیکن ٹھیک ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور دوبارہ ناکام ہونے پر سر واپس ٹیک کر مسکرانے لگا۔

اسے نوکروں کی مدد سے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد اس سے پوچھا کہ وہ کہاں تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ "سب جگہ" اس نے آہستہ سے کہا، "لیکن ٹھیک ہے۔"

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا، "روشن دانوں کی برف رہ گئی — اب کون ہٹائے گا؟"

الیوشا دو دن تک بستر پر رہا اور تیسرے دن انہوں نے پادری کو بلوا لیا۔

"تم مر رہے ہو الیوشا؟" تانیا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہم ہمیشہ زندہ کب رہتے ہیں؟" الیوشا نے فطری صاف گوئی سے جواب دیا، "ایک دن مرنا ہی ہوتا ہے۔" پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا، "اور دیکھو یہ بھی اچھا ہوا کہ انہوں نے ہمیں شادی نہیں کرنے دی۔ اب کتنا افسوس ہوتا۔"

وہ ٹھہرے ٹھہرے پادری کے کہے ہوئے الفاظ دہراتا رہا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر آدمی سب کی بات مانتا رہے اور کسی کو ناراض نہ کرے تو نہایت اطمینان سے زندگی گزارتا ہے۔

"اگر یہاں ایسا ہوتا ہے،" اس نے سوچا، "تو وہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہو گا۔"

اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ کسی وقت پانی مانگتا رہا۔ پھر اچانک وہ کسی بات پر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی چیز اسے حیران کر رہی ہے۔ آنکھوں میں پھیلی حیرت کے ساتھ اس نے ایک گہری سانس لی، بازو اور ٹانگیں سیدھی کیں اور مر گیا۔

(روسی)

انگریزی سے ترجمہ: سمیر ملال

Scanned with CamScanner

کیم مونزو

جہاں گرد

اس نے [illegible] کے ساتھ بیس سال سرکس میں گزارے۔ آج ایک جگہ پڑاؤ ہوتا کل دوسری سمت کوچ۔ ان بیس برسوں میں اس نے کبھی ایک شہر میں دوبارہ قدم نہ رکھا۔ کیا سرکس تھا وہ بھی! تیس تیس گھوڑے تھے، جیسے [illegible] گرد بے مقصد کہیں کہیں پھر رہے ہوں۔ بازی گروں کا بیٹا، بچپن ہی سے وہ خیمے اور اس کے ماحول میں مست رہا۔ بونوں اور مسخروں سے اس کی یاری تھی، شیر اور اس کے سدھانے والے، تار پر چلنے والے، گیندوں پر جھولنے والے، ایک کسے ہوئے گھوڑے اور ہاتھی اس کے ساتھی تھے۔ وہ بہت سی [illegible] اور [illegible] داستانوں سے واقف تھا جو چاروں [illegible] سے زندہ سلامت نکل آئے۔ چودہ سال کی عمر میں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی جو لگاتار تین دن دوسری قطار میں آ کر بیٹھتی رہی۔ تیسرے دن جب وہ اسٹیج پر [illegible] کا تماشا دکھا رہا تھا اور [illegible] کی مدد کر رہا تھا، لڑکی نے اس کو آنکھ ماری۔ وہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کرے۔ جب تک اس کو لڑکی سے بات کرنے کی ترکیب سجھائی دیتی، سرکس کے خیمے اکھڑ چکے تھے اور ویگنوں کی قطار دوسرے شہر کی طرف رواں دواں تھی۔

جب وہ بیس سال کا ہوا تو سرکس پر زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ سرکس سنیما اور ٹی وی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ جس سرکس میں ملازم تھا، اس سے اپنے جیسے [illegible] کے لیے [illegible] جن کو کسی دوسرے سرکس میں نوکری مل سکتی تھی، وہ وہاں چلے گئے۔ لیکن سب ایسے خوش نصیب نہ تھے۔ اس عمر میں کہ اسے کسی اور سرکس میں بھی جگہ مل سکتی تھی، اس نے اس پیشے کو خیرباد کہا اور کسی ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

وہ ایک ریلوے کمپنی میں کلرک لگ گیا۔ بیس سال تک اس نے اس شہر سے باہر قدم نہ نکالا۔ وہ [illegible] کی [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کرتے ہوئے گزرا

ٹکٹوں پر چھپے ہوئے شہروں کے جانے پہچانے نام دیکھ کر اس کا دل کبھی نہ مچلا کہ وہ دوبارہ وہاں جائے جس کو وہ دفتر کے بیس برس کا ہونے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ زندگی کے کئی بیس سال ایک خاموش، سنسان مکان اور بھاری دروازوں والے دفتر میں کاٹ دیے۔ بیس سال تک وہ ایک ہی سڑک پر چل کر دفتر جاتا رہا۔

شروع کے دنوں میں شام کے وقت بند دروازے کے پیچھے تنہائی سے اکتا کر اس نے پرانے بازی گر اور تمام شہروں کو یاد کرنا شروع کیا جو اس نے شہر شہر دیکھے تھے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ماضی اس سے دور ہوتا جا رہا ہو۔ شاید ٹھہری ہوئی زندگی گزارنے سے ایک خاص قسم کی طبیعت درکار ہوتی ہے۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس یکساں، ساکت زندگی کا عادی ہو جائے گا۔ وہ سوچتا، وہ ان دنوں اور یکسانیت کا حد سے عادی ہو گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، گھومنے پھرنے کی خواہش جاتی رہی۔ نہ صرف یہ کہ وہ یکسانیت کے خلاف کسی ردعمل کے قابل نہ رہا بلکہ اس میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔

لیکن ہر رات باقاعدگی سے، ایک کاریگر کی صناعی سے، وہ ایک متوازی زندگی خواب میں دیکھتا۔ وہ زندگی جو اس نے بیس سال تک دیس دیس گھوم کر گزاری تھی۔ ہر شب، ماضی کا ایک دن اس کے خواب میں جلوہ افروز ہوتا۔ اس طرح جب وہ چالیس برس کا ہوا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ سرکس ختم ہو گیا ہے اور اس نے ایک جگہ سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے چھت کسی لمحے اس پر آ گرے گی۔ بیس سالہ خواب سے جاگنے پر اس نے اپنی ساری جمع پونجی بیچ ڈالی، اسٹیشن پہنچا اور پہلی ٹرین پکڑ لی۔

وہ شہر شہر گھومتا پھرا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کھوئے ہوئے برسوں کا مداوا کرے گا۔ اس نے شہروں کی فہرست سے وہ نام کاٹ دیے جہاں وہ پہلے جا چکا تھا۔ پچاس برس کا ہونے تک وہ دنیا کا باقی آدھا حصہ بھی گھوم چکا تھا جو اس نے پہلی زندگی کے دوران میں نہ دیکھا تھا۔ ہر شہر سے نکلتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ اس کی پہلی نظر ہی آخری نظر ہوتی۔

تمام دنیا دیکھ لینے کے بعد اب کسی انجانی جگہ پر قدم رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ کئی شہروں سے اسے خواب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اس شہر کا نام یاد کرنے کی کوشش کی جہاں اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو پیار کیا تھا۔ وہ لڑکی اس کی ہم عمر تھی اور تاروں پر چلتی تھی۔ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ یاد نہ کر سکا کہ یہ وہ شہر برسوں تھا یا [illegible] کب اس نے تمام چیزیں تفصیل سے دیکھی تھیں، اس نے خود سے سوال کیا۔ اگر ایسا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے شہر کا نام یاد نہ رہتا۔ بہت سی جگہیں ایسی تھیں جن کو یاد رکھنا اب اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ ماضی کے کچھ حصے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ دریاؤں کی طرح وہ نہ بھی ہو کبھی اس کو یاد تھے۔ ہر دن دیکھنے کا ایک مقصد تھا جبکہ بالآخر یہ تمام شہر ذہن سے معدوم ہو جاتے تھے۔ اس نے سوچا، اسے پھر زندگی بھر سے ہوئے [illegible] کی مصنف

محسوس ہوئی

وہ پوسٹ کی مریض کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کی فہرست کا سب سے پہلا شہر اس کے ذہن سے بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کو احساس ہوا کہ اب اس کے لیے یہ یاد کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی ماں کیسی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی ماں کی شبیہ ایک اس سے بھی بڑی تحریر ہو اور بھوک میں گھل کر غائب ہوتی جا رہی ہو۔ بکری کی سیج پر بیٹھا وہ ریل کی پٹریوں کے بیچ اگی ہوئی خود رو گھاس کو تکتا رہا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اس کی نظروں کے سامنے کیا چیز تھی؟ وہ کیا دیکھ رہا تھا؟ کیا وہ جنگلی گھاس تھی؟ سرکنڈے تھے؟ کیا تھا؟ درختوں، پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نام اس کے ذہن سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ قطار میں اگے ہوئے سبز پودے کون سے تھے، اس نے خود سے پوچھا۔

اسے لگا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے … پٹڑی کی دوسری طرف ایک سرکس کا بڑا سا، پھٹا ہوا پوسٹر چسپاں تھا … اسے خوشی کا احساس ہوا۔ اسے سرکس دیکھنے کا جنون تھا … اسٹیج … تماش بینوں کی قطار میں بیٹھ کر سرکس دیکھنے کا جنون کچھ ایسا … اس نے تاریخ اور مقام دیکھنے کے لیے پوسٹر پر دوبارہ نظر ڈالی، لیکن اس کی نگاہیں پوسٹر پر بنے ہوئے چہرے پر اٹک گئیں۔ مسکراتے ہوئے چہرے کی ایک آنکھ پر … تھی۔ دوسری آنکھ کے نیچے ایک لکیر تھی۔ وہ مسحور ہو کر چمکتی ہوئی … دیکھتا رہا … اس نے دیکھا کہ ہونٹ درحقیقت ہنسی کی شکل میں کھلے اور بند ہو گئے۔

جب … پلیٹ فارم پر … وہ بنچ پر … دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔ جماہی لیتے ہوئے اس نے … نظر دوڑائی … یاد نہیں کہ وہ شہر کیسا تھا جہاں میں پیدا ہوا، اس نے تھک کر سوچا۔

اس کے کانوں میں دروازہ کھلنے کی آہٹ آئی۔ ایک عورت نے گردن نکال کر دروازے سے باہر جھانکا اور دونوں اطراف نظر ڈالی۔ پھر یہ چہرہ غائب ہو گیا … سے دروازہ بند ہونے کی … اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ آیا دروازہ بھی کھلا تھا، کوئی اندر گیا تھا، کوئی اندر گیا بھی تھا یا یہ کہ وہاں کوئی دروازہ تھا بھی یا نہیں۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھر … بھیگے ہوئے جنگل کے کنارے … چمکتا ہوا ایک … تالاب۔ یہ تصویر اتنی واضح اور صاف تھی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ منظر اس وقت اس کی نظر کے سامنے تھا یا وہ صرف ایک شبیہ تھی جو اس کے ذہن کے دریچوں میں ابھر آئی تھی۔ پھر … بادلوں پر قابو … ایک ایک کرکے شبیہیں ابھرنے لگیں۔ جیسے … ہوئے غبارے فضا میں بلند ہوتے ہیں … مسجد … دیواریں … فرنیچر۔ اچانک تمام تصویریں غائب ہو گئیں۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ صرف ایک سیاہ مستطیل رہ گیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون سے شہر جا رہا تھا۔ اس نے حیرانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ اسے یاد نہ رہا کہ وہ کون سی جگہ

تھی۔ دونوں طرف … گم ہو گیا … ہوئی … کی سمت … کر لیے … تک … کہ وہ کیا شے تھی … کوئی … دوسرے لفظوں میں … اس نے پھر یہ جاننے کی کوشش نہ کی۔

کتالان سے
انگریزی سے ترجمہ: زینت حسام

کیم مونزو (Quim Monzo)

١٩٥٢ میں بارسلونا (سپین) میں پیدا ہوئے … گرافک ڈیزائنر کے طور پر کام … ویتنام اور کمبوڈیا کی جنگوں کی رپورٹنگ کی۔ اپنی کہانیوں سے زیادہ شہرت پائی۔ لیکن فلموں میں مکالمہ نگاری … سکرپٹ نگاری اور ناولوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ کہانیوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ١٩٨٠ میں کتالان کریٹکس ایوارڈ حاصل کیا۔ ان کی کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا مجموعہ O' Clock ١٩٨٦ میں امریکا سے شائع ہوا۔

مظفر علی سید

اردو ادب کی صورتِ حال

۱

صورت حال یا سچویشن کیسی بھی کیوں نہ ہو ایک طرف نہایت مخدوش رپورٹ کی جاتی ہے اور دوسری طرف معمول کے مطابق، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مدت سے مخدوش چلے آنے کی وجہ سے ہی اس کا معمول بن گیا ہو۔

مخدوش ہونے کا ایک سبب انفرادی سطح پر ہنگامہ مذہبی قیادت کی خطر پسندی یا Brinkmanship بھی ہو سکتی ہے لیکن یہی رویہ اجتماعی سطح پر بحران پسندی اور بحران طرازی کی صورت میں کارفرما نظر آتا ہے۔ بعض معاشرے اس وقت تک حرکت ہی میں نہیں آتے جب تک کوئی بحران یا دوسرے لفظوں میں کوئی شدید تاریخی دباؤ درپیش نہ ہو اس وقت تک ان کی تمام صلاحیتیں خوابیدہ رہتی ہیں اور پھر نکلنے کا کوئی غیر متعین راستہ تلاش کر لیتی ہیں جو کسی نئے اور بڑے بحران کی طرف لے جاتا ہے۔

اردو ادب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی ہمیشہ بحرانی صورت حال درپیش رہی ہے تو یہ معمول کی بات ہو گی۔ بحران ہو ختم ہو ہی، بلکہ یہ ہونا ہو بحران کا مقدمہ ہے لیکن یہ خاص بحران جو ہمارے شکستہ شکست پیدا ہوا ہے، ان تمام بحرانوں سے، جن میں سے گزر کر اردو ادب ہم تک پہنچا ہے، کس لحاظ سے مختلف ہے اور ہمارے دور کی تخلیقی صلاحیت اس سے کیونکر عہدہ برا ہو پائے گی، ان سوالوں پر سوچ بچار شاید بیکار نہ ہو۔

اصطلاحی زبان میں گفتگو کریں تو مسئلہ بحران کی ساخت (Crisis Formation) سے زیادہ بحران کی شناخت (Crisis Perception) اور اس سے آگے بڑھیں تو بحران کی پیداوار (Crisis Management) کا ہے۔ جب بحران موجود ہے تو جلد یا بدیر سب کو تجربے میں کر رہے گا۔ چاہے ہم کتنے ہی بے حس کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ شتر مرغ کی طرح خود فریبی کی

Scanned with CamScanner

بھی کوئی حد ضرور ہوتی ہے۔ لیکن حساسیت کو دانشوری میں بدلنے اور کے بحرانوں کی نوعیت اور ماهیت کا ادراک کرنے، پھر ان میں سے زیادہ حصہ سے کام لے کر ان پر قابو پانے کی کوئی صورت نکالنے اور ان بڑے بڑے بحرانوں کو تاریخی سفر کی قوت محرکہ میں منقلب کر دینے یہ ہر حال صورت حال کی شناخت و پرداخت اور تفہیم و تجزیہ کے ہم معنی ہیں جن کا طے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

ممکن ہے ان اصطلاحوں کے استعمال ہی پر کسی کو اعتراض ہو، خصوصاً ادب کے سلسلے میں، کہ بالعموم مسائل کی تشخیص اور تشخیص کی حد تک تو ادب کو ایک کارگر وسیلہ تسلیم کر لیا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ ادب کو مسائل کے علاج کی طرف رخ کرنے کی جسارت بہت کم ملتی ہے۔ تاہم ادب ہمارے دکھوں کا مداوا کر سکے یا نہ کر سکے، ان کو ایک تاریخی تقاضے اور ایک اجتماعی قوت میں تبدیل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے۔ بقول میر:

مرے سلیقے سے میرے نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

محبت نباهنی، یا دوسرے لفظوں میں کسی بہت بڑی انسانی کمٹ منٹ سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت تبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم ناکامیوں کو اپنے حوصلے کی بحالی اور قابو پانے اور انہیں ایک تخلیقی توانائی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں کمٹ منٹ کا مفہوم ہے کام لینا اور کام سے چیز سے کہ جا سکتا ہے جو موجود ہو۔ گویا وضع موجود (Status Quo) سے کام لینا ہے۔ یا حاصل سے وضع مطلوب (Status Requisite) کا راستہ نکل سکتا ہے۔ پھر ناکامیوں سے کام وہی لے سکتا ہے جو سمجھ رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں میر صاحب کی عبارت کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ میر صاحب صرف یہ نہیں کہہ رہے کہ انہوں نے ایسا کیا ہے بلکہ ایک عرصہ کشمکش کے دوران بھی کارنامہ انجام دیا ہے کہ گویا ہر قدم پر انہیں ایک نہ ایک ناکامی سے واسطہ پڑا ہے۔ ہر ناکامی ہمیشہ ان کے لیے کسی نہ کسی کامیابی کی تمہید کا موجب بنی ہے لیکن خود بخود نہیں۔ اس لیے کہ تاریخ میں جو بھی مطلوبہ تغیر پیدا ہوتا ہے، شعور و دانش کے ذریعے پیدا ہوتا ہے، اس تاریخی شعور اور دانشورانہ کمٹ منٹ کے ذریعے جو تاریخی عمل کا مرحلہ اول ہے اور جس کے بغیر کسی بھی صورت حال پر دسترس حاصل نہیں ہو سکتی۔

میر صاحب کے طویل عرصہ حیات کی طرح، اردو ادب کی تاریخ بھی ناکامیوں سے کام لینے کی مسلسل کشمکش کا نام ہے، ایک ایسی کشمکش جس کا سلسلہ یہاں ہمارے سلسلۂ حیات کی طرح جاری ہے اور جس کا انجام وہی ہو گا جو ہمارا انجام ہو گا۔ تاریخ کے کسی بھی موڑ پر ادب کی جو بھی صورت حال ہو اس کے لیے ہمارے سوا کون ذمے دار ہو سکتا ہے، خصوصاً استعماری تسلط سے آزاد ہونے کے بعد۔

۲

تیسری دنیا کے بیشتر ممالک اس امر کے شاہد ہیں کہ استعماری غلبے سے بظاہر آزادی حاصل

۳

کرنے کے بعد بھی استعمار کی عمل داری کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتی ہے۔ اس کا ایک حصہ ہے: سیاسی استعمار کی بجائے معاشی اور تہذیبی استعمار، فکری اور تعلیمی استعمار۔ بڑے استعمار کی جگہ چھوٹا استعمار، انسانی استعمار، نسلی استعمار اور سب سے زیادہ خوفناک استعمار کی جگہ ملکی اور مقامی استعمار۔ بقول ایک فارسی شاعر کے:

اب تو ہم ہی شکاری ہیں، ہم ہی شکار

اس کیفیت کی، جس کا نام "خود استعماریت" (Self Colonization) رکھا گیا ہے کہ عرصہ رکھا گیا ہے، تیسری دنیا کی تہذیبی اور تخلیقی صورت حال میں متعدد عناصر پسِ پردہ فعال ہیں جو استعمار کے خلاف جدوجہد آزادی کے دوران موجود نہیں تھے یا جو اس وقت عدم حاضر تھے اور اب ہمارے باطن کا جزو بن چکے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ آزادی کے بعد نشر و اشاعت کے وسائل میں خاصی توسیع ہوئی ہے۔ لیکن توسیع کے ساتھ اسی کی نسبت سے زیادہ تحدید بھی ہوئی ہے۔ اسی طرح کثیر تعداد میں ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لیے بہت سے ادارے رسمی طور پر قائم کیے گئے ہیں۔ ان کی خوبی سے بحث ہو یا نہ ہو لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تہذیبی میدان میں ان کے وجود برقرار رکھنے سے کیا فرق پڑا ہے؟ کم از کم اردو ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ان اداروں کا کوئی واضح کردار سامنے نہیں آیا، ماسوا تنگ نظری اور بلند بانگ اعلانات کے۔

درحقیقت سرکاری سطح پر علمی ادبی اداروں کا وجود ہی اس بات کا شاہد ہے کہ ہم تہذیبی سطح پر خود استعماریت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ عام طور پر اس کی وجہ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ علم و ادب کے میدان میں سرکاری سرپرستی کے بغیر گزارا ممکن نہیں، اس لیے کہ غیر سرکاری اداروں یا تہذیبی نوعیت کا کام کرنے والے افراد کے پاس اتنے ذرائع موجود نہیں ہوتے جن کی مدد سے کوئی دور رس قسم کا جامع منصوبہ بروئے کار عمل میں لایا جا سکے۔ لیکن سرکار کی سرپرستی حاصل کرنے سے پہلے کوئی ادارہ موجود ہو یا پھر تہذیبی نوعیت کا کام کرنے والے افراد کے درمیان کوئی ادارہ رشتہ قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے۔ اس کی بجائے ہمارے یہاں جو بھی علمی ادبی ادارے وجود میں لائے گئے ہیں، سرکاری محکموں کے طور پر یا سرکاری محکموں کی زیر نگرانی کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لامحالہ خود ایک بیوروکریسی بن جاتے ہیں، ایک ایسی بیوروکریسی جو سرکاری بیوروکریسی سے زیادہ بیوروکریٹک ہو۔

چنانچہ "خود استعماریت" کا سب سے بڑا مظہر تہذیبی بیوروکریسی کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ ادیب وہ ہے جس کا نام کسی سرکاری فہرست میں لکھا ہو، چاہے اس نے کبھی کچھ لکھا ہو یا نہیں۔ شاعر وہ ہے جس کا کسی سرکاری ادارے سے معاہدہ ہو چکا ہو، نہ کہ وہ جس کی تصانیف پڑھی اور پسند کی جاتی ہوں۔ کوئی لکھنے والا ملک گیر شہرت کا حامل ہو یا بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہو، ہمارے سرکاری ادارے جب چاہیں غیر موجود بنا سکتے ہیں اور جسے چاہیں بحال کر سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سرکاری صورت حال بدلنے کے بعد ادبی صورت حال میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تاہم اس تبدیلی

سے علمی ادبی اداروں کی نوعیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ لکھنے والوں پر سے پابندی اٹھ جاتی ہے اور ان کی جگہ کچھ دوسروں پر لگ جاتی ہے، نئی تفسیر اور نئے دعوے ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کی پشت پر وہی پرانا بنیادی نقطہ نظر رہتا ہے۔ جیسے ایک تہذیبی بیوروکریسی بدل جاتی ہیں لیکن بیوروکریسی قائم و دائم رہتی ہے۔

۳

تعلیم کے میدان میں، جس کا ادب کی تخلیق اور ترویج دونوں سے گہرا تعلق ہے، یہ تو محسوس کیا گیا ہے کہ استعماری دور کا نظام آزادی کے بعد تبدیل ہونا چاہیے، اور اسے بعض ملکوں میں بڑی حد تک متعدد مرتبہ بدلا بھی گیا ہے لیکن نئی تعلیمی حکمت عملی نے نئے مقاصد وضع کرتے ہوئے نئے دور کی فکری ضرورتوں کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے۔ زیادہ تر تبدیلیاں جو روا رکھی گئی ہیں یا تو بے ضرورت تھیں یا محض ظاہری تھیں اور ہنگامی مسائل کی پیداوار۔ ایسی صورت میں تعلیم نے روزمرہ وظائف یعنی درس و تدریس، مرتب نصاب، امتحانی ... کی تیاری اور طلبا کی رہنمائی کے معیار کیسے متاثر نہ ہوتے؟ پھر سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت کا ذہنوں میں زور و شور کے ساتھ یہ گیا کہ بشری علوم اور ادبیات کی تعلیم سے معاشرے کی توجہ نامکمل ہٹ گئی (یہ بات کہ سائنس کی تعلیم بھی فکری سطح پر ... نہ ہو سکی)۔ اب ایسے میں ادب کی تعلیم تہذیبی اور دانشورانہ تناظر سے بے نیاز ہو گئی، چنانچہ تیسری دنیا کے متعدد ملکوں ... میں یہ شکایت عام طور پر سنی گئی کہ آزادی کے بعد سے غیر ملکی زبانوں میں تعلیم کا معیار قائم رہ سکا نہ ملکی اور قومی زبانوں کی طرف کوئی زوردار توجہ دی جا سکی۔ اسی طرح نئی نسل کے طلبا میں اپنے تہذیبی سرمائے کی طرف رغبت میں بھی کوئی اضافہ یا گہرائی پیدا نہیں ہوئی۔

تخلیق ادب کے لیے تعلیم ادب کی اہمیت بالعموم تسلیم نہیں کی جاتی۔ اس دلیل کے ساتھ کہ تعلیم ایک رسمی سرگرمی کا کام ہے جب کہ ادب غیر رسمی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں دی جانے والی تعلیم زیادہ تر رسمی قسم کی ہوتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب کہ یہ ادارے واقعتاً کام کر رہے ہوں، جو کہ تیسری دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن کسی بھی تہذیب میں رسمی تعلیم، تعلیمی عمل کا محض ایک حصہ ہوتی ہے، چاہے کتنا ہی ضروری حصہ کیوں نہ ہو۔

ہر زندہ معاشرے میں ایسے تہذیبی ادارے وجود رکھتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ادب کی غیر رسمی تعلیم کا کام کرتے ہیں۔ محفلیں، جمع کی سرگرمیاں، ادیبوں اور فنکاروں کا عام لوگوں سے میل جول اور آپس میں ربط و ضبط کے مواقع، تازہ واردانِ ادب کا بزرگانِ ادب سے مکالمہ، اور سب سے زیادہ معاشرے میں ایسے دانشوروں کا وجود جو ہماری تہذیبی اقدار کے ترجمان بھی ہوں اور تہذیبی ورثے کے پاسبان بھی۔ یہ سب مظاہر ہماری زندگی سے کاملاً رخصت نہیں ہوئے ہیں تو نظروں سے اوجھل ضرور ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ برصغیر کی تہذیب نے جو ایک منفرد ادارہ

مشاعرے کی شکل میں ترتیب دیا تھا۔ آزادی کا زمانہ آتے آتے زوال کی آخری حد کو چھو چکا تھا، اور اب اس کی جگہ اور تجدید کی جو کوششیں برصغیر سے باہر خصوصاً اور مغربی ممالک میں آباد برصغیر کے لوگوں نے شروع کی ہیں، وہ سب محض ... کی تہذیبی پیاس کا پتا چلتا ہے۔ شاید یہ جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ پیاس بجھ سکتی کس سطح پر ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ ادب کی غیر رسمی تعلیم کے ذرائع یا تو معدوم ہو گئے یا تہذیبی سطح پر غیر موثر ہو گئے۔ پھر رسمی تعلیم کے اداروں نے بھی اس خلا کو پر کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، نہ مغرب کی طرح ذرائع ابلاغ کا سہارا اور تعلیمی اسلوب آزادی کے ساتھ ممکن ہوا۔ چنانچہ آج ہمیں نوجوان شاعروں کے کلام میں جب کوئی مصرع ایک شعر سے کٹ کر ... ہوا ملتا ہے، تو خفا ہونے سے پہلے یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہماری رسمی یا غیر رسمی تعلیم نے کس نوجوان کو ایک شعر سے آشنائی پیدا کرنے کے لیے اور کون سے مواقع فراہم کیے ہیں؟ عروض کی تعلیم اور شعر گوئی کی تربیت نہ صرف یہ کہ ہمارے مدارس میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے بلکہ ادب پڑھانے والوں کی شان میں گستاخی نہ ہو تو یہ کہنا بھی کچھ بیجا نہ ہوگا کہ یونیورسٹی تک کی سطح پر کم ہی کوئی استاد میر، غالب یا اقبال کے مشہور اشعار کو کسی تغیر و تبدل یا الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے بغیر سنانے پر قادر ملے گا۔ ایسے میں ہم کسی نوجوان کہنے والے کو کس منہ سے الزام دیں؟

ممکن ہے واقعی بلند تعلیمی معیار سے ناواقف حضرات کو اس بات میں مبالغے کی بو آئے یا وہ شکایت کریں کہ یہ کہنا تو غلط ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے، لیکن اتنا ضرور مان لینا چاہیے کہ جب ادب کی تعلیم کا انحصار صرف و محض رسمی تعلیم کے اداروں پر ہو تو اس کے معیار کا بہت بہتر ہونا اور اس کے طریق کار کا رسمی انداز سے مختلف ہونا لازم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اپنے ادبی سرمائے اور اس کے بنیادی عناصر سے رغبت پیدا کرنے کا تعلق ہے، تو یہاں بھی ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی سسٹم کا طرز فکر محض مبہم نظر آتا ہے۔ ... کہتے کہ ہمارا کوئی تہذیبی سرمایہ ہی نہیں، لیکن وہ اس تمام ذخیرے کی محض فہرست بنا کر رہ جاتے ہیں اور اس سرمائے سے ہمیں فیض یاب کرنے کی بجائے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تعریف و توصیف ایسے کلمات میں کرتے ہیں کہ کسی بھی کلاسیکی کمال میں کوئی تخصیص پیدا نہیں ہوتی اور ایک سے دوسری تحریر میں کوئی امتیاز محسوس ہی نہیں ہو پاتا۔ ... کہا جاتا ہے کہ یہ پچھلے زمانے کی بات ہے اور یہ کہ ہمارے سب بزرگ اپنی اپنی جگہ احترام کے مستحق تھے اور انہوں نے جو کچھ کہا سب ہمارا ورثہ ہے۔ ممکن ہے تہذیبی معاشرے کا یہ انداز کچھ وقتی ضروریات رکھتا ہو، لیکن جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہمارے تہذیبی ورثے کا کون سا حصہ آج پھر ہمارے لیے کوئی معنویت اور اہمیت رکھتا ہے اور کسی لکھنے والے نے ہمارے سرمائے میں کیا خاص اضافہ کیا ہے، تو کلاسیکی دور کے جملہ کمالات طاق نسیاں پر دھرے رہ جاتے ہیں، اور احترام عام کا جذبہ انہیں ہمارے قریب نہیں آنے دیتا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود کسی نئے لکھنے والے کو اچھا مدرسہ یا اچھا ادب میسر ہو، کوئی آزمودہ کار استاد مل جائے، لیکن یہ امکان پھر بھی کم ہے کہ یہ کسی شخصیت سے اس

[illegible] کے لیے ہو [illegible] سطح پر مددگار ہو سکے یا اظہار و ابلاغ کی تربیت فراہم کر سکے۔ یہ ہے کہ ہمارے رسمی اور غیر رسمی تعلیمی اور مذہبی اداروں میں ایسی شخصیات کی [illegible] کھپت ہو اور کہیں کوئی مل بھی جائے تو اپنی جگہ شکایت کناں کہ کسی کو کچھ لکھنے کی ضرورت [illegible] یہی ہر بات لکھنے والا اپنی ہر تحریر سے کبھی تحریر کو صرف [illegible] سمجھتا ہے یہ رویہ غالباً اسی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہو گا کہ صحیفوں، جرائد اور منتظمین [illegible] حلقہ تکلفوں کی تعداد بڑھنے میں [illegible] ہوئے ہیں کہ ان کا معیار برقرار رکھنے کی ان کے پاس کوئی وقت نہیں رہ جاتا۔

ہمارا ادبی ماحول جس قسم کی متضاد پرستانہ گروہ بندیوں کا شکار ہے اور مختلف گروہوں کے [illegible] کے الفاظ میں۔ باہمی نفرتوں کے جو پہاڑ پیدا ہوئے ہیں ان کی زد میں سب [illegible] وہ لوگ بھی ہیں جو [illegible] غیرجانبدار رہنا چاہتے ہیں اور [illegible] رکھنے [illegible] کے حسین ساتھ برابر کا رابطہ اور سابقہ رکھتے ہوں، ان کا احوال اکثر یہی ہوتا ہے:

دل کو روؤں کہ اب جگر کو میں
میری دونوں سے آشنائی تھی

ادیبوں کے درمیان چشمک یا گروہ بندی بھی کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن رشک و رقابت کے [illegible] صحت مند مسابقت کا رجحان ہو تو کام کر سکتا ہے لیکن ہمارے ذہنی [illegible] اس قسم کی جو صف موجود ہی نہیں یا تو محض جنگ ہے یا غیر مشروط سپر ڈال دینے کی طرح اپنی اپنی جماعتوں سے سو فیصد غلامی طلب کی جاتی ہے، اور ذرا سی فکری آزادی کو [illegible] کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی قیادت میں [illegible] کو خود استعماریت کی ایک [illegible] کیا قرار دیا جائے!

خود استعماریت کا مہلک طریق کار ایک ایسی صورت حال پیدا کرتا ہے جس میں فکر و [illegible] محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی لکھنے پڑھنے والا [illegible] بھی مختلف قسم [illegible] حیرانی کی بات یہ ہے کہ "کلاس فرسٹ" کے زمانے میں بھی ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی [illegible] کمی نہیں جو استالن کیانداز میں سوچتے ہیں، اور ایسے محب وطن تو بہت ہیں جو احوال [illegible] پر سوچ بچار کرنے [illegible] چاہتے ہوں [illegible] دونوں [illegible] کے درمیان ہر وقت ایک تناؤ، ایک کھچاؤ، ایک سرد جنگ قسم کی کیفیت موجود رہتی ہے، [illegible] میں کسی لکھنے والے کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان دونوں سے لاتعلق یا غیرجانبدار رہ سکے، [illegible] ایسے لکھنے والوں کو کمٹ منٹ نہ کرنے کا الزام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جب دونوں طرف [illegible] کا رجحان واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہو تو کمٹ منٹ، دونوں میں سے کسی [illegible] سے نہیں، کسی تیسری چیز ہی سے ہو سکتی ہے۔ آزادی اور تہذیب کے ساتھ آپ کی کمٹ [illegible] کا مفہوم ہی یہی ہے کہ آپ ذہنی غلامی اور تہذیبی اجارہ داری میں سے کسی ایک کا ساتھ [illegible] اور کسی قسم کی خود استعماریت کو ممکن نہ ہونے دیں۔

[illegible] استعمار کی جن دو خصوصیات کو "استحصال" یعنی غرض سازی اور "استشمار" [illegible] اندوزی کا نام دیا ہے، وہ بھی خود استعماریت کے اس تہذیبی مظہر میں پوری طرح [illegible] کرتا ہے ایک ایسی عملی شکل میں جسے صرف ذہنی حریت کا نام دیا جا سکتا ہے

۲

اردو ادب کی تاریخ میں حشمت پریم چند نے رسالوں اور کتابوں کے ناشرین کے ساتھ حقوق اشاعت کے سلسلے میں جس کشمکش کا آغاز [illegible] سے [illegible] کی [illegible] اور جس کے بعد میں سعادت حسن منٹو تو سب سے زیادہ اصرار کی۔ ہمارے زمانے میں یہ مقدس کشمکش [illegible] کا شکار ہوئی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ ادیب کو امداد اور خیرات، وظائف اور سرپرستی [illegible] کے طور پر کچھ مل جائے تو [illegible] لیکن [illegible] رسالے میں لکھنے کا معاوضہ [illegible] کتاب کی اشاعت سے اپنا حق طلب کرنا [illegible] کی ذہنی صورت حال میں گناہ کبیرہ سے کم نہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن اداروں کی سربراہی سکہ بند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے اور جو زیادہ سے زیادہ اختیارات بھی چاہتے ہیں، وہی ایسے ادیبوں کے جائز حقوق کو کسی نہ کسی بہانے نظرانداز کرتے ہیں۔

آزادی سے پہلے ادبی کتابوں کی اشاعت کا جو نظام پیدا ہوا تھا، آزادی کے بعد دیر تک نہ چل سکا، ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی خرابیاں تھیں لیکن [illegible] قریب کے سہولت ہو [illegible] کے [illegible] یہ نظام پوری طرح [illegible] بالآخر ختم ہو کے رہ گیا [illegible] ہمارے یہاں ادبی کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے۔ چند ایک بردل عزیز مصنفین کو چھوڑ کر جن کی تعداد کوئی زیادہ نہیں [illegible] ہوتی ہے بلکہ کم ناشر سے مل کر کوئی ایسا [illegible] ہو جو پیشں قدمی کر کے [illegible] سے کسی طے شدہ معاہدے کے مطابق مسودات حاصل کرے، کتاب کی اشاعت پر سرمایہ لگائے اور اس کی فروخت کے ذریعے اپنے بال بچوں کے لیے روزی پیدا کرے۔ تو ایسی مخلوق کم از کم ہمارے یہاں تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔

معروضہ شاید یہ ہے کہ کو آپ ہی کتاب شائع کرنا چاہتے ہیں تو یہ تکلیف چونکہ آپ کو ہوتی ہے، لہٰذا اس کے لیے وسائل بہم پہنچانا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔ ہمارے زمانے میں ادبی کتابوں کی خاصی بڑی تعداد اسی معروضے کی بنیاد پر شائع ہوتی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ حقوق اشاعت کیا ہوئے تو شاید کسی ظریف کو [illegible] پیش کرنا پڑے گا کہ [illegible] کر یہ حقوق، ادیب کی طرف سے ناشر کو وجب الادا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ادبی نشر و اشاعت کا میدان بڑی حد تک ان ادیبوں کا مرہون منت ہو چکا ہے جو کہیں نہ کہیں سے اس کا انتظام کر سکیں [illegible] نہیں جب کسی ادیب کو مصنف بننے سے پہلے کوئی نہ کوئی وزارت کرنی پڑے گی کہ اس سے [illegible] کمتر قسم کے کام تو اب معمول بن چکے ہیں۔

اردو میں ادبی کتابوں کی اشاعتی مشکلات کے حل کا ایک طریقہ وہ بتایا جاتا ہے جو ہندوستان میں اختیار کیا گیا ہے وہاں زیادہ تر حکومت [illegible] تحقیق اور بعض اوقات محض [illegible] ریاستی صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی گرانٹ سے چھپتی ہیں [illegible] اداروں کی امداد [illegible] سے شائع ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر اس کے بغیر شائع نہ ہو

سکیں اور ان میں سے بعض کی اشاعت مستحسن قرار دی جا سکتی ہے تاہم ان میں اکثر کا مطالعہ عمومی سطح پر مفید یا کم از کم محفوظ سمجھا جائے تبھی ان کی اشاعت ممکن ہو۔ یہ علمی و تحقیقی کتابوں سے زیادہ اس کا نقصان تخلیقی ادب کو پہنچے گا۔

۱

لیکن کتابوں کی طباعت محض ایک معاشی معاملہ نہیں، ایک تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ کسی کتاب کے چھپ جانے سے بات ختم نہیں ہو جاتی۔ نہ رونمائی کی تقریب کے انعقاد اور اس کی خبر لگوانے سے کوئی خاص مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اصل چیز تو معاشرے میں اس آواز کا اثر و نفوذ ہے جو لوگوں تک پہنچائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی ایسی غیر نتیجہ خیز صورت میں موجود نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس کا حیثیت زندگی کے ساتھ پڑھنے والوں کے ذریعے ہو تو بہتر ہے لیکن بہت سی کتابوں کی پڑھنے والوں تک رسائی نہیں ہوتی اور بہت سے پڑھنے والوں کی کتابوں تک۔ کتابوں کی تقسیم اور فروخت کا نظام بھی معاشرے میں رکھتا ہو کہ موجودگی کے سبب کا بھی اور اس معاشرے کا بھی جسے موجودہ لوگوں کی ناموجودگی کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ برقیاتی وسائل کے زمانے میں کتاب کا چلن ویسے ہی کم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بات ان ملکوں کے بارے میں درست نہیں جہاں برقیاتی وسائل ہم سے کہیں زیادہ عام ہیں اور کہیں زیادہ پرکشش انداز میں دستیاب ہیں۔

واضح طور پر یہاں وہ مشکل پھر ظاہر ہے جسے ہندوستان کے مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون "اردو ادب کا آخری قاری" میں پیش کیا ہے اور جو مزاح کی ایک طرف معاصر ادب کا ایک بنیادی تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ چند ایک خوشنما اور اشتہاری قسم کی کتابیں خرید کر رکھ لیتے ہوں۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں جو اردو ادب پڑھتے ہیں اور کس صورت میں؟ اس سوال کا جواب کسی نہ کسی ادارے کو معلوم کرنا چاہیے۔

بات اس سے بھی آگے جا سکتی ہے، مگر فی الحال اسے یہیں تک محدود رہنے دیجیے، کہ صورت حال اتنی مخدوش ہو اور دیر تک یہی منظر بن جائے تو پھر لکھنے والے لکھیں کس کے لیے؟ اب تو یہی محل نظر ہے کہ جنھیں لکھنے والے کہا جا سکتا ہے وہ محض اس شوق میں لکھ رہے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں تو ان کی بات پہنچ بھی رہی ہے یا نہیں۔ چند ایک لکھ بھی رہے ہوں تب بھی لکھنے کا کام اس وقت تک ایک تہذیبی قوت نہیں بن سکتا جب تک ادب کو معاشرے کا درون حاصل نہ ہو۔ گویا ہم گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے بات چلی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس دائرہ عمل کو صرف ادیب ہی توڑ سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کامیاب نہ ہو پھر بھی کشمکش اسی کو کرنی ہے۔ تہذیبی نوعیت کا کوئی اکیلا کارنامہ صرف ادیبوں پر مرکوز نہیں رہ سکتا۔ نہ تنظیمی کارگزاریوں کا فیصلہ سرسری ملاقات کے ذریعے ممکن ہے۔ پھر بھی جو لوگ تخلیق ادب میں مصروف ہیں، انھیں اس سفر کے آخر میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنے کے قابل ضرور ہونا پڑے گا:

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی، جو مجھ سے ہو سکا

اردو کے منفرد ادیب

محمد خالد اختر

کی اولین تصنیف

بیس سو گیارہ

کا نیا ایڈیشن بہت جلد شائع ہو رہا ہے

نسرین انجم بھٹی

کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

سعید الدین

کی نظموں کا پہلا مجموعہ

رات

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

زوجین

یہ روح مرا گھر تھی
تو نے جو نظر پھیری
اک گنبد بے در تھی

گنبد میں اندھیرا ہے
سو رنگ کی درازوں میں
ناگوں کا بسیرا ہے

میں کاسۂ سر لے کر
تم کان لگاؤ گے
سنکھ سے وہ بجتا ہے
کچھ بھید نہ پاؤ گے

ٹکراتی ہے سر کوئی
سنتا ہے ادھر کوئی
اک منزل کی آوازہ
بے سود کوئی بدھ ہے
ظاہر میں ڈراں پیہم
ور سسکی پیہم
چہرے پہ رواں پیہم

Scanned with CamScanner

جھومر کی روشنی میں
اک زوج سوتی ہے
پر چاند کا خون مل کر
تن اپنا سجاتی ہے
جب جوڑی میں آتی ہے
گنبد میں بلاتی ہے

گنبد تو مگر بےدر
جاتی نہ صدا باہر
آتی ہو ادھر ڈر کر
کیا یہ تھا تمہارا گھر

نیند کی مخملی دھندلکوں میں
ڈوب جاتی ہیں زرکھیتی ستی

کسی دریا میں کوئی ساکت ناؤ
جسم و جاں کا رکا رکا سا بہاؤ

وہی مقسوم بسترِ زوجین
ایک پہلو میں ہول ایک میں گھاؤ

جب ہی اک خواب زندگی ساری
تیرے سرہانوں میں خوں کی خواب
فرش پر گر گئی ہے کتاب
درج تھا جس میں زندگی کا حساب

ہچکیوں میں تھمتی ہوئی بات
سوتی سوتی خیال آتا ہے
[illegible]
تا بہ کے اس کی میں کروں تکذیب

Scanned with CamScanner

پس تو پھر شکرِ ربِ ارض و سما
حکم سے جس کی ہر ابتدا ہے
شکر اس روز کا عطا جو ہوا
اور اس رات کا جو آئی ہے
ہم کو لے کر گھٹا کی بانہوں میں
سرمئی نیند کی پناہوں میں

باراں کی شب کھوئی رہی
ہم تن بہ تن، ہم رو بہ رو
برسات میں سوتی رہی

جیسے رواں تھا قافلہ
بیداریوں کی ریگ پر، بیگانگی کے خواب کا

جب کہکشاں تھی زمیں
جب منتشر تھی ہوا
جب نور پرورش کا بڑھا
عریاں عناصر میں گھرے
جاں سینچتی پرچھائیں میں
ہم خشک جاں ہم خشک تن
شکلوں بھرے ہو مرد و زن
شامیں تذبذب کی رہیں
کر کے بہانہ نیند کا
اک خواب میں روتی رہی
برسات میں سوتی رہی

مرے مرد نے رات اک خواب دیکھا
عجب دہشت اسے
کہ وہ جاگ کر ہم بمرد رہ گئی
خشک اور گرم سانسوں کو گنتا رہا

پیاس اپنی دبائے
یہاں تک کہ اس کے بدن کو شناور نے سمجھ کر جگایا

کہ میں جاگ کر ہم بخود رہ گئی
خشک اور گرم سانسوں کو گنتی رہی
اس کے خوابوں کے آسیب دل میں سمائے
یہاں تک کہ میرے بدن کی شناور نے اس کو جگایا

سو پھر ہم اٹھے
ور اندھیرے میں بچوں کے س کو ٹٹولا
ور اک کوزہ بھر آب آپس میں بانٹا
ابھی رات کے کچھ پہر بچ رہے تھے
سو پھر اس کی بستی میں داخل ہوئی میں
گزرتا ہوا سرخ سیلاب دیکھا
میرے مرد نے رات اک خواب دیکھا

جب تو نے پہلی میں دیا
میری طرف بڑھنے لگا
آئینہ رُو دیوانہ ہیں

اک اک قدم، جو دو قدم
آئینہ رو دیوانہ ہیں

خندہ خستی لب پر لیے
مذموم اشارے بھاڑ میں
اور غضب میں غول سگاں

میرا غم بھی چادر ہوگئی
اور اس کے پیڑو پر بندھی
میرے بدن کی دھجیاں

اب کیا کروں، پیچھے مڑوں
آگے بڑھوں، اس سے ملوں

اب کون مجھے آواز دے
اب ہم کہاں اور تم کہاں
جس سمت اٹھی ہے نظر
آئینہ خانہ ہے جہاں
آئینہ رُو دیوانے ہیں

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

نظمیں

بیتھ میرے کندھوں پر لوٹ رہی ہے

والٹر فرنانڈیز نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی
اس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا

میں والٹر فرنانڈیز کو نہیں جانتی
وہ میرے فلیٹس میں ای ۱ میں رہتا ہے

بیتھ میرے جسم کو لپٹائے ہوئے ہے

والٹر فرنانڈیز شراب سے چُور تھا
اس نے اپنی ماں کو مارا
اور حکومت کی پالیسیوں کو
نفرت سے بھری گالیاں دیتے ہوئے
خودکشی کر لی

بیتھ میری ٹانگوں میں پھنس گئی ہے

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

مطمئن

موت میرے کندھوں پر لوٹ رہی ہے

والٹر فرنانڈیز نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی
اس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا

میں والٹر فرنانڈیز کو نہیں جانتی
وہ میرے فلیٹ میں بی ۲ میں رہتا ہے

موت میرے جسم کو لپٹا لیے ہوئے ہے

والٹر فرنانڈیز شراب میں چُور تھا
اس نے اپنی جان کو مارا
اور حکومت کی پالیسیوں کو
نفرت سے بھری گالیاں دیتے ہوئے
خودکشی کر لی

موت میری ٹانگوں میں پھنس گئی ہے

کوئی گھنٹی بجا رہا ہے
باہر شور مچا ہوا ہے
بچاؤ، ٹھہرو، مر گیا
والٹر فرنانڈیز مرا نہیں
موت اسے نہیں آتی جو مرنا چاہتا ہے

رات کا ایک بجا ہے
بہت تیز گھنٹی بج رہی ہے
میں دروازہ کھولتی ہوں
مر گیا
سب بچ گیا
اس کا صرف سر ٹوٹا ہے
اور گاڑی کی شیشے جس پر وہ گرا تھا

میں ٹھنڈا سانس لیتی ہوں
میں کوئی بری خبر سننا چاہتی تھی

موت ابھی تک میرے کندھوں پر چڑھی ہوئی ہے

ایک بار تم نے مجھے
ساحلوں پر چُوما تھا

ایک بار تم نے پہلی بار
مجھے چوم کر کہا تھا
یہ تعلق ہے

اور میں نے اس تعلق کو اپنے ہونٹوں پر لگا رکھا تھا
ایک بار اس دیوار کے پیچھے
جہاں صرف دیوار دیکھ رہی تھی
ایک بار وہاں
جہاں دھول اڑاتا ٹرک ہمارے قریب سے گزرا تھا

Scanned with CamScanner

اور میں نے تمام چبھ جانے والی اذیتوں کی طرح
بس خوشی کو تمہارے سپرد کر دیا تھا

ایک بار جب تمہاری جیب میں
کسی دوسرے کی محبت رکھی ہوئی تھی
میں نے اپنی محبت تمہاری جیب میں رکھ دی
اور وہ دوسرے لگا لی
میں آج تک دوسری خوشیوں کے ساتھ پھرتی ہوں
میری محبت تمہاری جیب میں پڑی ہے
تمہاری جیب آج تمہارے پاس نہیں ہے
لوگ کہتے ہیں
تم آج تک اپنی جیب ڈھونڈ رہے ہو

ہر دن میں تمہارے اور اپنے درمیان ایک اینٹ رکھ دیتی ہوں
اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ
میرے پاس بجری اور سیمنٹ نہیں ہے
پانی بھی نہیں
بس یونہی ہی
میں انہیں تلے اوپر رکھتی جاتی ہوں

تم سمجھ سے پرے دور ایک کرسی پر بیٹھے ہو
صبح کی دھوپ سے منہ اٹھا کر کے
جہاں سمندر نہیں ہے
بارش نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے

اگر تمہارے اور اپنے درمیان
ان تمام اینٹوں کی دیوار بنا لوں
تو تمہارے حصے میں
سمندر دھوپ اور بارش نہیں آئے گی

پھر دھوپ
تمہاری پیٹھ پر بھی نہیں گرے گی

تم پلٹ کر دیکھو گے
تو وہ دیوار بھی نہیں ہو گی

Scanned with CamScanner

نظموں کے منتخب حصّے

۱۵

تمہارا روٹھنا اچھا لگا مجھ کو
یہاں دریا تھے
جو روتے ہوئے شہروں کے آنسو پونچھ لیتے تھے
یہاں جنگل تھے
جن میں محبوب سایوں کی عبادت کے لیے ہر روز دھنک پھر آتی تھی
یہاں تارے تھے
جو کھوئی ہوئی نظموں کو مل کر لوٹ لیتے تھے
یہاں قصبے تھے
جن میں مسکراہٹ اور اشکوں کے قبیلے ساتھ رہتے تھے
یہاں لہریں تھیں
جن کو کھیلنے ہی سے کبھی فرصت نہ ملتی تھی
یہاں چھاگل تھی
جس کو پیاس کے سائے سے نفرت تھی
یہاں اک دل تھا
جس کا ٹوٹنا اچھا لگا مجھ کو

Scanned with CamScanner

۱۸

خشک چشم پانی کی تلاش میں فٹ پاتھوں پہ گھوم رہی ہیں
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
اس سڑک کے ہاتھ کب تک خالی رہیں گے
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
دن نے رات کے کمرے میں آ کر لائٹ اف کر دی ہے
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
سمندر ابھی تک ورزش کر رہا ہے
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
محبت نے اسی کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
دھوپ مونگ پھلیاں کھانے کے شوق میں ایک ریلوے پر بیٹھ کر چلی گئی
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
محبت آنسو کسی سے بچنے کے لیے اندر آئی تھی
(یہ بلی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)

۲۰

مجھے تاروں کا شب جاگ اچھا نہیں لگتا
تم اپنی خواہشوں کے تنگ پاجامے کو آگ میں پھاڑ ڈالو گے
خدا بھی اپنی خاموشی کے بندھن توڑ سکتا ہے
مگر ان سسکیوں کا بیٹھ سے کیسے تعارف ہو
مجھے یہ بند کھڑکی کھول لینی ہو
محبت کو الف بے سیکھنے میں وقت لگتا ہے
تم ان سڑکوں کو تنہائی کے بستر سے اٹھا دو گے
مجھے بھی آگ سے ملنے کا کتنا شوق تھا پہلے
گیا تو تھا مگر مٹی نے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولا
میں ان لمحوں کا گلدستہ تمہارے گھر پہ چھوڑ آیا
تم اپنے شہر کے دروازے کب تک بند رکھو گے

۱۳

ہر محبت کے اختیار میں آؤ
یا کسی دھوپ رنگ کار میں آؤ
اس طرح میں سمجھ سکوں گا تمہیں

*

مجھ سے ملنا ہو تو قطار میں آؤ
یہ مرے گیت ساتھ لے جاؤ
تاکہ تم بھی کسی شمار میں آؤ
جیب خالی ہے ذہن خالی ہے
ایک شب کے لیے ادھار میں آؤ

۱۷

ایک لڑکی جو رات آئی تھی
یہ اداسی وہ ساتھ لائی تھی

۱۹

بیٹھ سے گر ہو ملاقات
تو کہنا کہ کوئی پوچھ رہا تھا
اور ہاں دیکھو
رات کی جانب جو کبھی جاؤ
تو اسے یاد دلا دینا
کہ ایک وعدہ کیا تھا اس نے

۱

خدا نے مجھے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر زمین سے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے

۲

یہ کہانی یہاں سے چلتی ہے
اس کی محبت تو ناخنوں میں جمے ہوئے میل کی طرح ہے
جسے کبھی بھی کھرچ کر صاف کیا جا سکتا ہے
تم پوری زندگی اس نظم کے سرہانے بیٹھ کر نہیں گزار سکتے
اسے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھلا دو

۴

یہ کہانی یہاں سے چلتی ہے
میں نے سوچا تھا کہ پھولوں کی تنہائی میں اسے خط بھیجوں
دھوپ کو کیسے سمندر میں کوئی غرق کرے

Scanned with CamScanner

بادہ کو مہک پلاتی ہے کسی نے شاید
ہی یہاں موت سے ملنے تو نہیں آئی تنہا
سمای سے تو بھلائی کی نہ رکھو امید
یہ سمندر بھی تو دریا میں سماتا تھا کبھی
پنی انکھوں سے کہو
س طرح خواب نہ نیلام کریں

۱۰

یرے ہاتھوں نے پہلے بھی کئی دروازے کھولے ہیں
ئی سڑکوں کو یہ قصہ سنایا ہے
ئی تاریکیوں کے داغ دیکھے ہیں
کئی دریاؤں کے کھر بار لوٹے ہیں
کئی پیڑوں کے کپڑے پھاڑ ڈالے ہیں
کئی جسموں میں اُس کا عکس دیکھا ہے

۱۱

س نظم کی آنکھ میں لیموں کا ایک خود رو پودا اُگ آیا ہے
جس کی خوشبو تمہیں رخصت کرتے کے بے کل کی موڑ تک تمہارے ساتھ جائے گی
اس کی جیبیں کچے خوابوں سے بھری ہوئی ہیں
یہ نظم بس ایک بار تمہیں چھو لینا چاہتی ہے
اس پر پہلے بھی پاگل پن کے کئی دورے پڑ چکے ہیں
یہ نظم تمہارے ہونٹوں کا جغرافیہ یاد کر رہی ہے
اس کی سڑکوں پہ کئی جلوس منتشر کر دیے گئے ہیں
س نظم کا تمہاری انکھوں سے کیا تعلق ہے
یہ ان ستاروں سے ہاتھ ملا کر آ رہی ہے
ب یہ تمہارے جسم کی شاہراہوں پہ آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار ہو جائے گی

۱۲

تمہارا تصوّر عدم کا پتّا توڑ کر رات پر بھوشکنی لٹکتا ہے
رات میرے دن میں چھپ جاتی ہے
تمہارے پنجے محبت کا منہ نوچنے لگے ہیں
محبت میرے دل میں چھپ جاتی ہے
تم معصومیت کے بغیر اس درخت کی طرح ہو

جس نے اپنی سبز چادر اتار کر فٹ پاتھ پر پھینک دی ہے
مسکراہٹ کی خالی پلیٹوں سے میرا پیٹ نہیں بھر سکتا
سمندر کے پاس خشک دریاؤں سے ملنے کے لیے وقت نہیں ہوتا
تم ہتھیلیوں کی نرم گھاس ہونٹوں زبان سے ناواقف ہو
تم نے میرے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی ہیں

۴

صبح کا ہاتھ ہے پھر رات کی دروازے پر
کسی کھڑکی سے وہ آواز سی جھانکے گی
ہم بڑے خوابوں کے کشکول لیے بیٹھے ہیں
گو تو چاہے کہ یہ آفاق کی دیوار مگر
اس طرف بھی ہیں دن رات کا چکر نہ ملے
یہ جہاں باپ سے ورثے میں ملا ہے مجھ کو
میں کسی روز تجھے تجھ سے جدا کر کے چلا جاؤں گا
ہاں محبت کو تو ہر شخص برا کہتا ہے
اتنے رستے تھے کسی نے بھی نہ روکا مجھ کو

۵

میں یہاں ایک بن بلایا مہمان ہوں
فرشتے مروتاً مجھے ہیلو ہیلو کہتے ہیں
دھوپ مجھے دیکھ کر عادتاً مسکراتی ہے
دریاؤں نے ستاروں کی سفارش پر مجھے اپنے کنسرٹ میں شریک کیا
زمین اپنے دسترخوان سے مجھے اٹھانا مناسب نہیں سمجھتی
ہواؤں نے میرے کاغذات کی جانچ پڑتال صحیح طریقے سے نہیں کی
میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اس لنگڑی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں ہے

۸

وہ اپنے ہونٹوں کا چنگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا
میں التجا کے لرزتے پل پر نہ جانے کب تک کھڑا رہوں گا
وہ جانتا ہے کہ میری شاخیں سدا محبت سے اس کے سر پر جھکی رہیں گی
وہ اپنے ہونٹوں کا چنگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا
میں اس کے قدموں کی گرد سے اپنے ہاتھ میلے نہیں کروں گا

Scanned with CamScanner

وہ اپنی خوشبو کا جگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا
میں اس کی آنکھوں کے زرد صفحات پڑھ کے چپ تو نہیں رہوں گی
وہ اپنی خوشبو کا جگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا

میں نے دیہاڑی کو اک نظم سنائی تھی کبھی
جیسے سورج کے گلے پر کوئی خنجر رکھ دے
جیسے کشتی میں کسی خواب کا سہما ہوا بچہ روئے
جیسے تاروں کو کوئی دن میں جگانے آئے
میں نے دیہاڑی کو اک نظم سنائی تھی کبھی

۱۱

تم میرے لفظوں سے کب غیب کو لے کے چلی جاؤ گی
خواب کیوں کے بغیر زیادہ اچھے لگتے ہیں
تم ہم سے پوچھے بغیر کمرے میں گھس آؤ گی
چند چڑیوں کے بل صحن میں گھوم رہی ہے
درخت پانی پلانے والوں کو تم یاد نہیں رکھتے

۲

یہ کہانی صندل کے درخت اپنے ساحل میں باندھ کر بھول گئے تھے
یہ عکس میں نے تن کے پیالے سے چرایا ہے
یہ خواب گھر جاتے پرندوں سے راستے میں بچھڑ گئے تھے
تمہاری نظموں کا یہ البم میں نے کئی نظموں کے عوض زمین سے خریدا ہے
تم کسی پہاڑی چشمے کی خوشخبری کی طرح مجھے ملے
میں تنہا بیٹھی ہوئی مہمانوں سے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی
بس اپنے خوابوں کو جلا کر ان کی راکھ ان پودوں کے حوالے کر دوں گی
جنہوں نے تمہاری تصویریں اٹھا رکھی ہیں

۳

یہ دیواریں میرے سینے پر آ کر بیٹھ جاتی ہیں
مجھے ان کھڑکیوں کے میلے چہرے زہر لگتے ہیں
یہاں سے بس میری تصویر میرے ساتھ جائے گی
مجھے تو آگ سے اگلا ایندھن سا کر دیا

Scanned with CamScanner

۱۳

جب سے ان ستاروں کے سر سے سورج کا سایہ اٹھ گیا ہے
انہوں نے گھر جانا چھوڑ دیا ہے

۱۶

اس نظم نے پتھراؤ کر کے ساری کھڑکیاں توڑ ڈالیں
اب یہ کرچیاں مجھے سونے نہیں دیں گی
یہ خون تمہیں نظر آ رہا ہے
پھر وہ گھوم کر اندر آ گئی

"کرسمس کی رات میں نے خود کو سمندر کے حوالے کر دیا، صبح اس نے مجھے سیپ اور گھونگوں کا تحفہ دیا۔ لو دیکھو!

پچھلے دن میں تمہارے پاس آ رہی تھی کہ راستے میں دھوپ مل گئی، میں بہت دیر تک اس کے ساتھ گلیوں میں پھرتی رہی۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئی، اس نے مجھے اپنی ماں سے ملایا اور پھر اپنے کمرے میں لے جا کر میرے ہونٹ چوم لیے

تم میرے چہرے کو دیکھ رہے ہو۔

ستارے مجھے اپنی داستان سنانا چاہتے تھے مگر میں ان کو جل دے کر وہاں سے بھاگ اٹھی۔ ان کو دست درازی کی عادت ہے۔ میں [illegible] تمہیں سب کچھ بتا دوں گی"

۱۸

یہ نظم اس کی یادوں کی پناہ گزیں کیمپ کا معائنہ کرنا چاہتی ہے
یہ دروازہ اس کی آمد کی خوشی میں اپنی قمیص کے بٹن لگانا بھول گیا ہے
درختوں کے ہاتھ کانپ رہے ہیں
زمین کی بھوک کم ہو گئی ہے
محبت ہمیں اس ٹھنڈے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی

۲

لڑکیوں نے معروں کی زبان میں کہا: اب ہمارے گھروں میں آنسوؤں کی بوریاں نہیں سکھائی جاتیں
ہمارے پاس انہیں ڈھونے کے لیے گدھے نہیں تھے
آخر ہم وہاں انجیر کھانے تو نہیں گئے تھے
درختوں نے ہمیں خوش آمدید نہیں کہا
زندگی نے ہم سے ملنے سے احتراز کیا

رات کے پہروں سے کھسکتے خواب کئی بار تمہارے بیڈ روم کی تلاشی لے چکے ہیں
محبت کی پہلی گولی میرے سینے کے بائیں جانب لگی تھی
درخت تمہاری ہنسی کے پرندے پکڑنے میں ناکام رہے
دریا تمہاری چال بہتے بہتے جامے سے باہر ہو گئے
محبت کی دوسری گولی میرے سینے کے عین وسط میں لگی
ہوا تمہارے لمس کی باتوں میں آ کر اپنی ساری جائیداد نیلام کرنے پر تیار ہو گئی
کرنیں تمہاری انگلیوں کی سیر کرنے کے شوق میں اپنے ماں باپ سے مہجور گئیں
محبت کی تیسری گولی سامنے والی دیوار میں لگی

۹

یہ تنہائی گزشتہ کئی صدیوں نے مل کر میرے اکاؤنٹ میں جمع کرائی ہے
اور محبت میں نے تمام جاننے اور نہ جاننے والوں سے چوری کی ہے
یہ دکھ ستاروں نے اپنی وصیت میں میرے نام چھوڑا
اور آنسو میں نے سمندروں کے گھر پر ڈاکا ڈال کر حاصل کیے
جو خوشی مجھے ملی تھی وہ میں نے پرندوں میں بانٹ دی
اور آزادی دریاؤں نے چھین لی
میرے سارے کپڑے آگ نے مانگ لیے
اور جوتے ہوا نے پہن لیے
سورج نے میری کھال غور سے دیکھی تھی
اور بادلوں نے مجھے ورزش کرنے کا مشورہ دیا
تب یہ گونگی اور بہری سی چیز مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے آئی

۱۰

تم ایک دن میرے ہاتھوں میں گھل مل جاؤ گے
میں نے پہلے بھی کئی سیل بند خاموشیاں توڑی ہیں
درختوں سے گفتگو کی ہے پرندوں کی بولیاں سیکھنی پڑتی ہیں
تم میری زندگی کا ایک چھوٹا سا راز ہو
ایک دن میں تمہارا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے دوں گا
اور آسمان کا اتنا مذاق اڑاؤں گا
کہ وہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا
دن کی یہ خالی پلیٹ میری نیند پر پڑی رہ گئی

۱۱

وہ باتیں جو دریاؤں نے زمین کے خلاف کی ہیں
وہ بیویاں جو گھر سے نکل کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں
وہ صدائیں جو الفاظ کی کال کوٹھڑیوں میں پڑے پڑے بوڑھی ہو گئیں
وہ راتیں جو سورج کے ناگہاں حملے کے ڈر سے رات بھر کروٹیں بدلتی ہیں
وہ قصبے جنہوں نے مسلسل فاقوں سے تنگ آ کر زہر کھا لیا
وہ سلسلے جو ہم سے ملاقات کرنے میں ناکام رہے
وہ کرسیاں جن کی گود ہمیشہ خالی رہی
وہ خدمتیں جو بند کھڑکیوں سے ہاتھ ملا کر واپس چلی گئیں
وہ آنسو جو جلدی میں اپنا سامان ساتھ لانا بھول گئے
وہ ستارے جو اپنی سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گئے
وہ کمرے جنہیں ویرانی نے کرائے پر لے لیا ہے
وہ سڑکیں جنہیں شہری آبادی سے باہر نکال دیا گیا ہے
اور وہ آنکھیں جو خوابوں کے کسی قصبے کے چوک پر لٹکا دی گئی ہیں
سب اس کی مسکراہٹ کی تہوں میں زندہ ہیں

۱۲

ایک چیونٹی میرے بازو کا تفصیلی سروے کر رہی ہے
میرے ذہن میں کسی نے کئی دراز کھول کر زمین پر الٹ دیے ہیں
میں پیدائش سے بہت پہلے تمہیں جانتا تھا
یہ ساری تصویریں اسی وقت کی ہیں
یہاں تم کسی پھول کی سالگرہ میں شرکت کے لیے سج رہے ہو
ہوا گھر سے آیا ہوا ٹیلیگرام پڑھ کر بے ہوش ہو گئی ہے
یہاں تم ستاروں کے ساتھ بیٹھ کر خوابوں کا رقص دیکھ رہے ہو
یہ میلی چادریں تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر دماغی توازن کھو بیٹھی ہیں
یہاں تم دریاؤں کے ساتھ کورس میں کوئی گیت گا رہے ہو
گزشتہ کئی دنوں سے اس تصویر کا منہ کھلا ہوا ہے

۱۳

آنسوؤں کی شکایت کرنا بیکار ہے
کسی نے میرے ذہن کے پانچویں ریکارڈ روم میں جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا ہے
صرف یہ چند ادھ جلے کاغذات میرے ہاتھ لگ سکے ہیں
جن کی دستاویزات سے اپنی پہلی تمہارے جسم کے رموز جانتی ہیں

Scanned with CamScanner

رات کے پہروں سے لپٹی حرف کی بار تمہارے بعد روم کی تلاش لے جنگل میں
محبت کی پہلی گولی میرے سینے کی بائیں جانب لگی تھی
درخت تمہاری ہنسی کے پرندے پکڑنے میں ناکام رہے
دریا تمہارے چال چلتے میرے جسم سے باہر ہو گئے
محبت کی دوسری گولی میرے سینے کے عین وسط میں لگی
جو تمہاری قمیص کی بانہوں میں اکر اپنی ساری جانبداد نیلام کرنے پر تیار ہو گئی
کرسی تمہاری سسکیوں کی سیر کرنے کے حوال میں جنم جان باپ سے بچھڑ گئیں
محبت کی تیسری گولی سامنے والی دیوار میں لگی

۴

یہ خیالی گزشتہ کئی صدیوں سے مل کر میرے اکاؤنٹ میں جمع کراتی ہے
اور محبت میں جو کام جانے اور سے ڈرتی سے چوری کی ہے
یہ دلو ستاروں نے میں وصیت میں میرے نام چھوڑا
اور آنسو میں نے سمندروں کے کھیر پر ڈاکہ ڈال کر حاصل کیے
جو خوشی مجھے ملی تھی وہ میں نے پرندوں میں بانٹ دی
اور آزادی دریاؤں نے چھین لی
میرے سارے کپڑے کہ میں ملنگ ہے
اور خواب میں نے پہنی تھی
سورج نے میری کہانی خود سے سنی تھی
اور بادشاہوں نے مجھے ورزش کرنے کا مشورہ دیا
سب یہ کوسکی اور میری نے جتنی مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے آئی

تم ایک دن میرے باطن میں گھر مل جاؤ گے
میں نے پہلے ہی گلی سیل مند خاموشیاں موڑی ہیں
درختوں سے گفتگو کے لیے پرندوں کی بولیاں سیکھیں بڑی ہیں
تم میری زندگی کا ایک چھوٹا سا ر ہو
ایک دن میں تمہارا ہاتھ ہو کے ہاتھ میں دے دوں گا
اور سمندر کا سب سے قد زلی گا
کہ وہ یہاں سے نہ تو کہیں اور چلا جائے گا
دن اتنی یہ خالی چاہے میری نسل پر پڑی رہے گی

اپنا باقی وقت میں رات کی کوکھ پر گزارنا چاہتا ہوں
ہاں تم کوئی ستارہ بن کر میرے ساتھ رہ سکتی ہو

۶

بادلوں کی جھاڑ پونچھ کرنے والے ہاتھ ٹوٹ گئے

۷

دریا پھر کسی سفر پر نکل گئے ہیں
درختوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا ہے
ہم ایک ہی سمت بڑھتی لہروں کی طرح ایک دوسرے میں مل جائیں گے
زمین نے شادی کے تحفے میں مجھے یہ چٹائی دی ہے
جس کے ہر کونے میں ایک دریا سو رہا ہے
اور آسمان نے مجھے ایک چھوٹا سا ستارہ دیا ہے
جس نے اپنی جیبوں میں بادلوں کے ٹکڑے چھپائے ہوئے ہیں
تمہاری آنکھوں میں مسکراہٹ کا ایسا پرندہ ہے
جس کی چونچ سے خواب گرتے رہتے ہیں

۸

یہ خوابوں کی فائل اٹھا کر دوبارہ الماری میں رکھ دو
آج میں کچھ نئے خواب دیکھنا چاہتا ہوں

۹

میں زندگی کے زنگ آلود گیٹ پہ بیٹھا موت کی ڈاک کا انتظار کرتا رہتا ہوں
ڈاکیا مجھے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی اور دن کا وعدہ کر کے کسی اور گلی میں مڑ جاتا ہے

اور بارش میری آنکھوں میں سسکیاں بھرنے لگتی ہے
وقت اپنی دھوپ سے بھرے ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیتا ہے
اور تم میرے ذہن کی آخری منزل سے چھلانگ لگا دیتی ہو
تنہائی کے شل ہاتھ مجھے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں
دن کی ڈوبی ہوئی کشتی رات کی لہروں سے سمجھوتا کر لیتی ہے
ستاروں کے دروازے زندہ بچ جانے والوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں

Scanned with CamScanner

مجھے ٹوٹے ہوئے لفظوں سے جوڑ دو
مری ان انگلیوں کو کاٹ کر پھر اس کی ٹیبل پر سجا آؤ
مجھے دوزخ کی کھوہ میں گرا دو
محبت ہو تو شعلوں کی تپش سے ڈر نہیں لگتا
مری آنکھوں کے دامن خشک کر کے اس کے دروازے پہ چھوڑ آؤ
ہوا میں اس کی سانسیں گھل گئی ہیں
مجھے ان سرد جھونکوں کے فقط دو گھونٹ پینے دو
میں ان کو گیت لکھنا چاہتا ہوں

۴

میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں
ہوا کے بازوؤں میں لرزش درخت اور دریا کا ہاتھ چھوڑ کر بھاگتی لہریں
تمہیں کچھ نہیں بتا سکتیں
میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں
تمہاری بے احتیاطی اور تلخ الفاظ محبوب کی رو میں غصے کی طرح
میرے جوتوں پہ سر رکھ کے سو جاتے ہیں
میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں
تمہاری انگلیوں کا ذائقہ دھوپ جیسا ہے
میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں
تم اپنے ہونٹ کب تک الماری میں رکھے رہو گی
میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں
تمہیں معلوم کہ بال تمہاری پلکوں سے زیادہ خوش ذائقہ ہیں
میں آہستہ آہستہ تمہیں پی رہا ہوں

۲۲

ایک عرصے کی سوچ بچار کے بعد میں نے شاعری سے شادی کر لی
تقریب میں دیگر مہمانوں کے علاوہ ایک پاگل کتے نے بھی شرکت کی
تقریب کے دوران اس نے ایک چاقو سے اپنا سینہ کھولا
اور اپنا دل نکال کر میری پیٹھ پر رکھ دیا
"لو اسے کچا ہی کھا لو"
پھر اس نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا
"اب یہ شادی کامیاب رہے گی"

۶

Scanned with CamScanner

۳۳

یہ وہ نظمیں ہیں
جنہیں گندی نالیوں نے اپنا منہ بند رکھنے کے وعدے پر خرید لیا تھا
لیکن ہمدردی کے دو بول کسی کی زبان کھولنے کی مناسب قیمت ہے
میں نے پوری قیمت نقد ادا کی
اور ان نظموں کو اپنے گھر لے آیا
لیکن غیر یقینی مستقبل کا خوف ان کے ساتھ چلا آیا ہے
میں زیادہ عرصے تک انہیں اپنے گھر میں بند کر کے نہیں رکھ سکتا
اس لیے میں نے دھوپ سے کہہ دیا ہے
کہ وہ کسی دن آ کر انہیں یہاں سے لے جائے

۳۲

بیٹی پڑوسی کے کتے کو چپ کرانے چلی گئی ہے
رات بیزاری کے ساتھ بیٹھی اپنے دوپٹے میں پیوند لگا رہی ہے
دن نے کسی مالدار بیوہ سے شادی کر لی ہے
رات کے آنسو اس کے پرانے دوپٹے میں گر کر جذب ہو رہے ہیں

۹

میرے اندر کوئی چیز جل رہی ہے
تم مری سانسوں کی دہلیز پہ رک جاؤ گے
اتنی گرمی میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا
خون میں گھومتے شعلوں سے کوئی ہاتھ نہیں تاپے گا
یہی نقطہ ہے جہاں آگ بھی اک چیز پگھل جاتی ہے
تم مرے خوابوں کے جنگل سے نہیں بچ سکتے
تم بھی اک روز پگھل جاؤ گے
میرے ہاتھ تمہیں کئی نئی بولیاں سکھا دیں گے
میرے ہونٹ تمہارے جسم کے تفصیلی دورے کی تیاریوں میں مصروف ہیں
یہ پھول گلدانوں سے کوئی بات نہیں کریں گے

۹

آنسو تمہاری تصویریں جمع کر رہے ہیں
ان کتابوں کے اعضائے تناسل کٹے ہوئے ہیں، تمہاری کوکھ کبھی ہری نہیں ہو گی

اس دکھ نے گزشتہ کئی صدیوں سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے ہیں
خون پینے کے لئے مخصوص سیکشن کے بجائے مچھروں کو سرحدوں تک بھیجا جاتا ہے
محبت کو یہاں پہلے بھی کوئی نہیں پوچھتا تھا
میرے جسم کے کئی حصے تم سے اندھیرے میں ملنا چاہتے ہیں
درخت کسی ضروری کام سے بھی اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں جا
سکتے
آسمان ستاروں کے باپ کی جاگیر نہیں ہے
بادلوں نے سورج کے خلاف پھر بغاوت کر دی ہے
تمہاری آواز میری روح کی جلتی لکڑیوں پر قطرہ قطرہ گر رہی ہے
زندگی کسی ٹوٹے ہوئے بال کی طرح بکھری اور سلامت ہے
اس غم نے میری بستیوں میں گھونسلا بنا لیا ہے
گھاس کے چند بیوقوف تنکوں کی تسلی جینے کے لیے کافی نہیں
تم میرے دل کی بنجر زمین کو اپنے قہقہوں سے آباد کر دو گے
محبت ناخنوں کے رستے میرے اندر داخل ہوئی
تمہاری کل والی مسکراہٹ ہر لحاظ سے فیصلہ کن تھی
اب اس شہر کی چابیاں تمہارے پاس رہیں گی
میری انگلیوں کی ہر پور تمہاری خوشبو میں شرابور ہے
میرے ہاتھ کی ہر لکیر پر تمہارے دستخط ہیں
تم نے بغیر کچھ دیے مجھے حاصل کیا
میرا دل ایک ایسا پیالا تھا جس کی تہہ میں پیشر جیوں کی گرد جمی ہوئی تھی
تم نے اسے اٹھا کر اپنے ہونٹوں کے ٹھنڈے چشمے کے نیچے رکھ دیا
میری روح ایک ایسا مکان تھی جس میں ایک عرصے سے مکڑی کے جالے رہ رہے تھے
تم نے اس کے ہر کونے میں کرنوں کے گملے رکھ دیے

۴

صبح تمہاری آنکھوں سے چلتی ہے
اور مایوسی اور سستی کی وادیوں میں پسیج کر دن کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے
تمہارے ہونٹوں کی گلیوں میں سورج کا خون بکھرا ہوا ہے
تمہاری ہر آواز نے رات کا گلا گھونٹ دیا ہے
تمہارے دوپٹے کے ہاتھ بادلوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں
میری آنکھوں نے تمہیں چوم چوم کر اپنا بیڑا غرق کر لیا ہے
تم ان پرندوں کو کب تک اڑنے سے روکو گے
میرے ہاتھوں کی گھٹن اب ان کی منتظر ہے

تمہارے بائیں کان سے چپکا ہوا ستارہ کئی بار میرے دل کی سرحدوں کی خلاف ورزی کر چکا

۲۲

مچھروں کے منہ کو خون لگ گیا ہے
اب یہ پنکھا ہوا کے ہاتھ نہیں لگے گا
ان سفید چادروں کو کون روز میلا کرے گا
آسمان ستاروں کی چور بازاری سے اپنا پیٹ پال رہا ہے
سورج نے ایک عرصے سے پھولوں کو جیب خرچ نہیں دیا
زمین اپنی مفلوج ٹانگوں کی وجہ سے کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتی
اتنی خوبصورت آنکھوں کے ساتھ تمہیں کہیں کی بھی شہریت مل سکتی ہے
محبت نے مجھے تمہارے ارد گرد گھومنے والے کیڑوں تک سے تعلقات بنانے پر مجبور کر دیا ہے
میں تمہارے کسی بھی جگہ کے بالوں میں شامل ہونا پسند کروں گا
تمہاری پلکوں کی جنگی میں لرزش اس نظم کی قسمت بدل سکتی ہے
بادلوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے سے کوئی نہیں بچا سکتا
چاند نے سمندر کو رات کے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ لیا تھا
خود لذتی اس دوری کا علاج نہیں صرف ایک کوشش ہے
رستے میں پڑے گوبر کی چھت سے ہاتھ ہلاتی گندم کی بالیاں تمہیں نظر نہیں آتی کیا
ٹوٹی ہوئی شاخوں نے اپنی نئی شادی شدہ بچیوں کے لیے گھر خالی کیا ہے
تمہاری ٹانگوں میں چھپا ہوا پرندہ تراشنگی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے
تصورات میں کئی بار میں نے تمہارے جسم کی ڈکشنری سے استفادہ کیا ہے
یہاں بادلوں کے کھوٹے سکے بھی کام آ جاتے ہیں

۴

محبت مجھے نوچ نوچ کر کھا رہی ہے

۵۱

تمہارے ہاتھ کے شمال مشرقی حصے میں میرے نام کی تختی لگی ہوئی ہے
تم نے میرے دل کے ایک ایک چپے میں بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں
میں نے تمہاری آنکھوں کی سرحدی چوکی پر قبضہ کر کے دل کی طرف پیش قدمی شروع کر
دی ہے
اب ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے

Scanned with CamScanner

محمد خالد اختر

ہندوستان کی سرسری تاریخ ۔ ۱

ملک ہندوستان کی اچھوتی یادگار تاریخ

جس میں ہر راگھشسوں، تین شہروں (اصلی)، چوبیس ہونے والی باتوں اور چار سو نہ ہونے والی باتوں، مہم جنگوں، قحطوں، وباؤں، مستقل جنگ آزماؤں، پانچ اعظم بادشاہوں اور بہت سے عام نام بادشاہوں (اور ملکاؤں) کا ذکر ہے اور جس میں (مجبوراً) چند تاریخیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

از

خالد اختر (بی ایس سی انجینیرنگ)

و

جناب ایم خالد (بی اے، پنجاب یونیورسٹی)

انتساب

یہ کتاب بصد عزت و احترام عالی جناب شریف ملک شفیق الرحمن کے نام معنون کی جاتی ہے جن کی حسب فرمائش و زیر ہدایت اس تاریخ کی ترتیب و تالیف عمل میں لائی گئی۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ور گر قبول نہ افتد زہے عز و شرف

سرسری مقدمہ

ہمارا۔ یعنی کم مایہ مصنفین کا اس تاریخ کا مقدمہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ زمانے کے دستور کے مطابق کتاب کے لیے مقدمے لازمی ہوتے ہیں، ہم بھی مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ (ہمارے بہت سے موقر حضرات، مثلاً مسٹر ... (این) مس ... بی بچ ... وغیرہ نے ازراہ محبت اس کا مقدمہ لکھنے کی پیش کش کی تھی، مگر ہم نے ان کو باز رکھا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم خود لکھیں گے۔)

محبت تمہاری انگلیوں کے بہتے ہوئے پانی میں بہتے دوپٹے پر جھکتی ہے
اور اُڑ کر میرے دل کی شاخ پر بیٹھ جاتی ہے
محبت تمہارے سینے کی دونوں چوٹیوں کو سر کرتی ہے
اور آ کر مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں دکھاتی ہے
محبت تمہاری راتوں کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو جاتی ہے

احمد فواد

سوات میں پیدا ہوئے چند سال پشاور کی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا آج کل چترال کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد ہیں۔ نظموں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ ہندوستان کی پہلی آخری تاریخ ہے۔ اس سے پہلے اس ملک کی کئی مفصل اور ضخیم تاریخیں بہت سے مشرقی اور مغربی مورخوں کی لکھی ہوئی موجود ہیں مگر یہ آخری تاریخ ہے جس کی ضرورت کو ایک عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد مزید تاریخیں غیر ضروری ہو گئی ہیں، اور اگر پھر بھی کوئی اصحاب (یا لوگ) اس میدان میں اپنے جوہر دکھائیں، تو وہ اصحاب (یا لوگ) اس کے خود جوابدہ ہوں گے۔

یہ مستند آخری تاریخ ہے جس کے بعد تاریخ کے طالب علم کو دوسری کسی بیچھلی تاریخوں کے پڑھنے کی حاجت نہیں رہے گی۔ سب ضروری معلومات، جو ہمیں سکول کے زمانے سے یاد رہ گئی تھیں، اس میں جمع کر دی گئی ہیں اور اسے ہر طرح سے مکمل اور مفید بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ اس تاریخ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف لاتعداد واقعات کی تاریخیں لکھنے سے اجتناب برتا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تاریخوں کی بھرمار سے اکثر طالب علموں کا ذہن مشتبہ ہو جاتا ہے اور قوت حافظہ (طالب علموں کی) جواب دے جاتی ہے ویسے بھی ہماری رائے میں، اور غالباً اس مسئلے کی رائے میں بھی، وقت ایک اکائی ہے، اور ٹھہرا ہوا ہے، آگے پیچھے نہیں جاتا۔ ہم خود ہی وقت میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جس میں وقت کا کوئی قصور نہیں۔ یہ مجبوری کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی، پوری طرح ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔

ایک دوسری (امتیازی) خصوصیت اس تاریخ کی یہ ہے کہ اس کی تالیف میں اپنی، اور اپنے احباب (اے بکرا، ایف اے ایل اور مس حمیدہ ناز وغیرہ) کے حافظوں سے مدد لی گئی ہے اور اسکول میں پڑھی ہوئی تاریخوں یا دوسری تاریخوں کو بلاوجہ الٹا پلٹا نہیں گیا۔ اس لیے یہ آخری ہونے کے ساتھ اوریجنل بھی ہے یعنی بالکل اصلی۔

تیسری (امتیازی) خصوصیت یہ ہے کہ ۱۰۰ ابھی ابھی ہمارے ذہن میں تھی، اور ایک سوچیں نہیں رہی ۱۰۰ بار یاد آ گئی)۔ وہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آخر تاریخ کیوں پڑھی جائے۔ تاریخ کا جاننا (ہمارا خیال ہے کہ) ان کے لیے لازمی اور ضروری ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کی تاریخ کیا ہے اور وہ اپنی موجودہ حالت کو کیسے کر پہنچے۔

آخر میں ہم، یعنی مصنفین، اپنے ان سب دوستوں اور بہی خواہوں (مسٹر اے بکرا اور حمیدہ ناز وغیرہ) کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مفید بنانے میں ہمیں طرح طرح کے بیش قیمت مشورے دیے۔ ہم نے وہ مشورے قبول نہیں کیے۔ اگر ہم ایسا کرتے تو یہ کتاب سارے کی ساری مشوروں کی کتاب بن جاتی اور اس آخری تاریخ کو دوبارہ لکھنا پڑتا۔

اہم گزارش

ہم نے اس تاریخ میں سب راجوں، مہاراجوں، بادشاہوں اور نامور اصحاب (بشمول حیوانات)، جن سے ہندوستان کا نام روشن ہے، انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی۔ اگر ان میں سے بعض ہمارے خلاف عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں (ان باتوں سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جو ہم نے ان کے بارے میں کہی ہیں) تو اس

سے کوئی ان کو فائدہ نہیں ہو گا کیوں کہ وہ سب کے سب وفات پا چکے ہیں / چکی ہیں

م - خ - ا

م ح

طبع دوم کا مقدمہ

کتاب کا پہلا ایڈیشن اصل مسودے کی شکل میں مصنف نے شہر کے ناشر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا (مصنفین خود یہ نفیس نفیس یہ ایڈیشن لے کر گئے) مگر ان صاحب نے اسے چھاپنے سے معذوری ظاہر کی (بسبب خوش اخلاقی کے) حالانکہ ہم نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اس آخری تاریخ کو چھاپنے کا یہ آخری موقع ہے اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ یہ درسی کتاب ہے۔ محبت بددلی کی حالت میں ہم نے اپنے مسودے کا ذکر اپنے دوست اجمل کمال صاحب سے کیا جو "آج" رسالہ نکالتے ہیں اور دوستوں کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ انہوں نے سرسری تاریخ کو پہلے تو مجلہ "آج" میں قسط وار شائع کرنے کی حامی بھری اور پوری کی پوری چھپ جانے پر کتاب کا دوسرا ایڈیشن کہلائے گی۔ ہمیں مسرت ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ دوستی کی بنا پر نہیں بلکہ کتاب کی افادیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے کیا ہے۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں اور ان کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد وہ پشیمانی سے بچے رہیں۔

ہم نے پہلے ایڈیشن یعنی اصلی مسودے، کی بیس یا سات عکسی نقول نکلوا کر مختلف حضرات کی خدمت میں پیش کیں اور چند ایسے قدردانوں کو بھیجی گئیں جنہوں نے بالعموم کتاب کو پسند کیا جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی۔ ایک دو حضرات نے بیش قیمت تبصرے بھی کیے۔ اور قدردانوں نے ہمیں خوش گمانی کے پیغامات بھیجے۔ ان آراء میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"یہ ہندوستان کی سرسری تاریخ ہے" (توپ و تفنگ)

"مصنفین کی آخری کوشش قابل داد ہے۔ وہ اپنا وقت کسی بہتر کام میں صرف کر سکتے تھے" (ماہنامہ الو)

"آپ کی آخری تاریخ بہت پسند آئی۔ نہ معلوم آپ نے کہاں سے اتنی معلومات اکٹھی کیں۔ آپ کا یہ تاریخی نسخہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ پالتو جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے مکوڑوں کو بھول گئے۔ لیکن آپ کو مکوڑوں سے کوئی دشمنی ہے؟" (مسٹر اے بکرا کے خط سے)

"ابھی نہیں پڑھ سکی۔ اپنا تازہ ترین فوٹو بھجوائیے" (حمیدہ ناز کے خط سے)

یہ آخری مقدمہ ہے۔ طبع سوم پر مقدمہ نہیں ہو گا۔

م - خ - ا بی ایس سی

م - خ بی اے

باب اول

وادئ سندھ کی تہذیب کا عروج و زوال

اسے ہڑپّا موہن جو دڑو کلچر بھی کہتے ہیں۔ یہ تہذیب آج سے چار پانچ ہزار سال قبل اپنے شباب پر تھی۔ اس تہذیب میں سانس لینے والے خوش نصیب لوگ اب سب کے سب مر چکے ہیں۔ وہ لوگ جو آج کل ہڑپّا موہن جو دڑو میں یا ان کے آس پاس رہتے ہیں، موجودہ کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کو چار پانچ ہزار سال بعد دریافت کیا جائے گا۔ اس تہذیب میں خاص بات یہ ہے کہ یہ بہت قدیم اور یادگار تہذیب تھی یعنی اس زمانے کی جب مصر میں فرعون کی حکومت تھی اور فلسطین میں حضرت موسیٰ کی امت بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اتر رہا تھا۔ ہم اپنے کلچر پر فخر کر سکتے ہیں جو اس وقت کی دنیا کی دوسری درجے کی ترقی یافتہ قوم تھی (اس بکواس ایف ۔ اے فیل کی بھی بھی واٹ ہے)۔ حالانکہ اب ہمارا نام تیسرے درجے کی ترقی پذیر قوموں میں سرفہرست ہے اتنا ہی ذاتی تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنی زبان میں جو سب چیزیں کے لئے ٹھیک حروف سبھی ہوتے تھے باوجود اس کی شرح جو مذکر پچاس فی صد تھی اور جی این پی (گراس نیشنل پروڈکٹ) بارہ فی صد۔

موہن جو دڑو ہڑپّا اور اس تہذیب کے دوسرے شہروں کے کھنڈرات کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ کسی ریاضی دان معمار نے بڑے قرینے سے ان کا خاکہ ڈالا ہو گا۔ مغرب کی سمت اینٹوں کے وسیع و عریض چبوترے پر گڑھی اور راستے میں سیدھی سیدھی صاف چوڑی سڑکیں اور گلیوں کے دونوں طرف پختہ اینٹوں کے دو منزلہ مکان جن کی کھڑکیاں سڑک کے رخ نہیں ہیں۔ غسل خانہ پختہ ہوتا تھا، اناج گھر، ہر گھر میں پانی کی نکاسی کی موریاں تھیں جو ایک ڈھکی پختہ بدرو میں لے جاتی تھیں۔ (ہم، اس کتاب کے ناچیز مصنفین نے حکومت کو تجویز پیش کی ہے کہ وہ لاہور کراچی اور دوسرے شہروں کے میونسپل حکام کو موہن جو دڑو کے ڈرینیج کا نظام دیکھنے کے لئے بھیجے تاکہ وہ اپنے شہروں میں اسے رائج کر سکیں۔ حکومت کی جانب سے ابھی کوئی جواب نہیں آیا)

ان شہروں کی کھدائی میں چند انسانی مورتیاں بھی برآمد ہوئی ہیں اور بہت سی نرم پتھر کی مہریں جن پر کمانی دار سانڈوں، گینڈوں اور شیروں کی تصویریں کمال فنکاری سے کندہ کی گئی ہیں اور سنگ مرمر کی مورت ہے ایک چھوٹی سی داڑھی والے ایک شخص کی جو وضع یا پجاری کا ملا جلا ہے مونچھیں منڈی ہوئی مختصر داڑھی گھٹا ہوا سر ایک کندھا ایک تیپ ڈالی گیا ہے (شمپ ہوا) بیل بوٹے ہوئے ہیں ... وہ ممکن ہے سکوں پر ہی ہو جو بھٹک کر موہن جو دڑو میں آ نکلا ہو۔ سب سے دلاویز اور آرٹسٹک مورتی کانسی میں ڈھلی ہوئی ایک رقاصہ لڑکی کی ہے۔ ماسوا ایک کنٹھ مالا اور چوڑیوں سے ڈھکے ہوئے ایک بازو کے بالکل برہنہ دوسرا بازو ایک کولہے پر رکھے اور ایک ٹانگ کو ہلکا سا خم دیے یہ ستے ہوئے چھریرے بدن کی لڑکی اس شوخ ادائی سے کھڑی ہے جیسے اسے کسی کی پروا نہ ہو۔ اس مجسمے سے معلوم ہوتا ہے کہ وادئ سندھ کے لوگوں کو شرم و حیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ... ایک اور ایک

بہت کچھ ... اور موہن جو دڑو ... کی گلیوں میں گھومتی پھرتی ہیں، ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جنسی بے راہ روی عام تھی۔

ان کو پالتو جانور رکھنے کا شوق تھا۔ ویسے ہی کتے بھینس اور چند دوسرے جانوروں کو خواہ مخواہ پالنے کی لت ہوتی ہے ... کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ... سے پتا ہوتا ہے اور سواری کا کام لیتے تھے۔ گدھوں ... اور گھوڑوں سے ... کی واقفیت نہیں ہوتی تھی اور وہ ... کے خلاف تھے ورنہ ان کو مصر و میسوپوٹیمیا سے درآمد کر لیتے جن ملکوں کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ برسبیل تذکرہ ہم خود گھوڑوں کے سخت خلاف ہیں کو گدھوں کے لئے ہمارے دل میں نرم گوشہ ہے۔ مصر و شام کو بھی وہ سوتی یا بحری ... کپاس ... (بغیر ... کی)، شکر ... وغیرہ ... (یہ معلوم نہیں کہ فرعون اور اس کے امرا شکروں کو کیا کرتے تھے۔)

لٹریچر اور آرٹ میں اس بڑی قوم نے کئی کارنامے سر انجام دیے مگر چونکہ ہم ان کی زبان نہیں جانتے یہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔ ... کتابیں چھاپنے کا رواج نہ تھا۔

... ہمارے محققین کے درمیان یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ وادئ سندھ کی تہذیب میں مادری نظام رائج تھا یا پدری۔ ڈاکٹر ... کی رائے میں یہ تہذیب مادری تھی۔ ایک اور محقق رشید ملک کا دعوا ہے کہ یہ تہذیب سراسر پدری تھی۔ ہم بعض وجوہات کی بنا پر جو ہمیں خود بھی ... طرح معلوم نہیں ... کوئی ... نہیں کرتے۔ ہماری رائے میں یہ تہذیب مادری پدری تھی۔ ... کہ یہ لوگ جنہوں نے ... عظیم الشان تہذیب کی بنا ڈالی کون لوگ تھے ... کہاں سے آئے تھے۔ بعض کئی محققین نے نظریات پیش کیے کہ وہ وسطی ایشیا یا آسٹریلیا یا جنوبی ولایتوں کے جزیرے ... سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ... یہ مسلّم ہو چکا ہے کہ وہ کہیں سے ... نہیں تھے بلکہ اصلی باشندے تھے اور شروع سے یہیں رہتے بستے تھے۔

یہ بھی ... نہیں ہوا کہ یہ تہذیب ... علد کی طرح صفحۂ ہستی سے کیسے مٹ گئی۔ ... کہ یہ تہذیب ایک مدت سے روبہ زوال اور پوری ہو چکی تھی۔ ان کے شہروں میں ادھر ادھر کے مہاجروں نے ... شہری نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ چوکوں اور سڑکوں کے بیچ جھونپڑے کھڑے کر لیے تھے پھر شمال مغرب سے ... لوگ اپنے جنگی رتھوں میں ... کی طرح ... ہڑپّا ... سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ... لوگوں کو ... کے گھاٹ اتار ... اور ہر ایک چیز کو تہس نہس کر دیا۔ یہ کرنے کے بعد ... خود اپنی ... کو بھی تہس نہس کر ڈالا اور سندھی کی طرح ... ویسے ... ہو گئے۔

اس آفت کے بعد وادئ سندھ کے شہروں میں الو بولنے لگے۔ (پہلے وہ شہروں کے باہر ویران جنگلوں میں ہوتے تھے) وہاں کے پالتو جانور ... کتے بلیاں ... طوطے وغیرہ (جن کی طرف ان لوگوں نے خاص توجہ نہیں دی تھی ... کو ... نے تھپایا تھا) کچھ مدت تک ... کا انتظار کرتے رہے پھر اپنی ... کو ... دل چھوڑ بیٹھے یا مر گئے۔ شہروں کے مکانوں، حویلیوں اور راج محلوں کو جھینگروں، شیروں

Scanned with CamScanner

[illegible] میں رہنے پذیر تھے
اور وہاں سے مسلسل ہوائیں رہتی تھیں)

وادیٔ سندھ کی تہذیب کی عبرت ناک انجام کے چند سو سال بعد تک ہندوستان میں مطلقاً سناٹا چھایا رہا، اور کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے ان چند سو سالوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔

(بعض مقامی محققین مثلاً موہن رام سوہنی وغیرہ نے [illegible] کے مطابق موہن جو دڑو اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کو موہن نے شروع کیا تھا یہ غلط ہے اس زمانے میں موہن سوہن وغیرہ نہیں ہوتے تھے وہ بعد میں آئے۔

جماعت اسلامی کے ایک لیڈر مولانا فلاح الدین نے حال ہی میں اپنے ایک بیان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب پر فحاشی اور بےحیائی کا الزام لگاتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اس تہذیب کو "دفن" کیا جائے اور درسی کتب دوبارہ لکھی جائیں جن میں اس تہذیب کا ذکر نہ ہو۔ [illegible] میں رکھنے کی بجائے بحیرۂ عرب میں پھینک دیا جائے۔ جماعت اس بارے میں صوبائی اسمبلی میں ایک بل پیش کرنے پر بھی غور کر رہی ہے۔

ہماری رائے میں چونکہ یہ تہذیب اب واقع ہو چکی ہے اس کو جوں کا توں رہنے دینا ہی مناسب ہے۔

باب سوم

آریوں یا آریاؤں کا ہندوستان کے ملک میں ورودِ مسعود

ان لوگوں کی وادیٔ سندھ پر حملے کے تین سو سال بعد آریوں یا آریائی لوگوں نے ہندوستان کا [illegible] پر حملہ کرنے کی طرح سے نہیں آئے تھے بلکہ سے آباد کرنے کی خاطر، کیونکہ تب ہندوستان [illegible] اپنے اصلی باشندوں کے [illegible] سے اس زمانے میں وہ لمبے تڑنگے سفید فام [illegible] دیگر [illegible] اصلی باشندوں نے [illegible] کی کوئی مزاحمت نہ کی، انہوں نے سمجھا کہ آریائی ملک میں محض سیاحت و تفریح [illegible] ہیں، اور گھوم پھر کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے پھر جب آریائی نے پاؤں پسارنا، بستیاں بسانا اور زمینوں پر قبضہ جمانا شروع کیا، تو اصلی باشندوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اصل باشندے، جو قدرے سیاہ رنگت اور چھوٹے قد کے لوگ تھے، بالآخر آریائی سے پوچھا کہ وہ اپنے اصل وطن کو واپس چلے جائیں جہاں سے وہ آئے تھے، اور اگر ان کو اپنے مویشیوں کے لیے چارے کی ضرورت ہے تو اسے ان کے اصل وطن کی زمین پر ہی اگایا جا سکتا ہے۔ مگر آریاؤں نے یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ اب انہوں نے الٹا بیچارے اصل باشندوں کو، جو دراوڑ، بھیل، گونڈ، تامل وغیرہ شامل

سے تھے پیچھے دھکیلے [illegible] کی زمینوں پر قدم جمانے کے علاوہ [illegible] اپنے بہتر کلچر کی وجہ سے [illegible] کامیابی ہوئی [illegible] گونڈ، تامل وغیرہ جنوبی ہندوستان میں جا پہنچے جہاں وہ اب تک مقیم ہیں۔ تامل آدم کا پل عبور کر کے لنکا میں جا بسے [illegible] (حالانکہ وہ [illegible] نہیں ہیں) [illegible] کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ [illegible] اب کافی مہذب ہو گئے ہیں [illegible] دوسرے کو [illegible] کی طرح [illegible] کی تحریک چلائی مگر چونکہ [illegible] ملک ہندوستان پر قبضہ کر کے اصل باشندے بن چکے تھے، اس لیے اس تنازع کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔

آریہ آئے تھے یا نہیں آئے تھے؟

بعض جدید محققین کی رائے ہے کہ [illegible] لوگ کوئی قوم نہیں تھے [illegible] گھر بار چھوڑ (اگر ان کا کوئی گھر بار تھا) [illegible] ہندوستان [illegible] دوسرے [illegible] ہیں کہ [illegible] ہماری دو بڑے محققین [illegible] میں اس مسئلے پر شدت کی [illegible] ڈاکٹر [illegible] ہندوستان میں [illegible] ڈاکٹر وزیر آغا جھنگ جانتے ہیں۔ ہماری رائے میں (اور اس مکر [illegible] کی رائے میں) آریائی ضرور ہندوستان میں [illegible] کیونکہ [illegible] بھیل، گونڈ، تامل، دراوڑ وغیرہ صرف جنوبی ہندوستان میں [illegible] ویسے بھی [illegible] کی "موج در موج" آنا لازمی تھا، کیونکہ [illegible] کی صورت میں (موج در موج) ہندوستان کی تاریخ کی ابتدا نہ ہوتی، اور نہ ہمارے اس اعلیٰ تاریخ پیش کرنے کی نوبت آتی۔

آریوں یا آریاؤں کا کلچر

یہ غلط ہے کہ آریائی ایسے ویسے لوگ تھے [illegible] جنگلی تھے۔ [illegible] کلچر تھا [illegible] بالخصوص ایگری کلچر میں وہ اس دور کی دوسری قوموں سے بہت آگے تھے۔ ہندوستان میں پہنچ کر انہوں نے [illegible] جوت کر [illegible] وغیرہ کی فصلیں [illegible] (اصل باشندوں کا کلچر تھا نہ ایگری کلچر [illegible]) [illegible] انہوں نے ایگری کلچر کے علاوہ دوسرے پیشوں میں بھی مہارت پیدا کی [illegible] جو صاحبوں کے بغیر ممکن نہیں۔

آریوں یا آریاؤں کا مذہب

ہر کسی کی طرح آریاؤں کا بھی مذہب تھا [illegible] سورج چاند [illegible]

شیش ناگ (یا جام صاحب) گھوڑے، ہاتھی، شیر اور ہر وہ بڑی چیز کی پرستش کرتے تھے (ہم [illegible] نہیں سمجھ سکے)، وہ [illegible] [illegible] کو پوجنے لگے اور پکے [illegible] ہو گئے۔

آریوں یا ہندوؤں کے مشاغل کھیل کود وغیرہ

وہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور ٹینس جیسے کھیلوں کے حق میں نہیں تھے [illegible] کی تال پر ناچتے گاتے اور [illegible] کرتے۔ جوش میں اکثر یہ گھربار، ڈھور ڈنگر سب کچھ بھول جاتے، اور پھر تو ہر ایک لنگوٹ پہنے کسی قریبی جنگل کا رخ کرتے۔

باب سوم

رام چندر ہنومان اینڈ کمپنی

رام چندر (یا راما چندرا) وشنو کے [illegible] اوتار تھے (ہم تفصیلات میں نہیں جاتے کیونکہ یہ سرسری تاریخ ہے) اور خالص آریائی [illegible] اپنی قوم کا فرد بتاتے ہیں۔ [illegible] (یعنی اودھ) کے راجا دسرتھ کی بڑی مہارانی کے بطن سے جنم لیا۔ یہ راجا کثیر الازدواج تھا جو اچھی بات نہیں، اور جس کی وجہ سے رام چندر (راما چندرا) کو بن باس کاٹنا اور اپنی معصوم پتنی سیتا کو لانے کے لیے لنکا پر [illegible] کا اپنا بیٹا بھرت راج پاٹ سنبھالے (راجا دسرتھ بوڑھا ہو چکا تھا اور اسے حکومت میں دلچسپی نہ رہی تھی) [illegible] کا وچن لے لیا۔ آریائی لوگ ایسے وچن سے پھرنے کو مہا پاپ جانتے تھے (ہم سمجھتے ہیں راجا دسرتھ بہت زن مرید تھا)۔ قصہ کوتاہ رام چندر اپنی سب سے چھوٹی سوتیلی ماں کے بیٹے بھائی لکشمن [illegible] جنگل میں اپنا آشرم بنایا اور وہیں [illegible] اور پھل پھول پر گزر اوقات کرنے لگے۔ [illegible] (گو یہ معلوم نہیں ہو [illegible]) [illegible] (راما چندرا اور لکشمن شکار پر گئے ہوئے تھے اور ایک سونے کے ہرن کا پیچھا [illegible] اور لکشمن شکار سے لوٹے تو سیتا جی کو اپنی کٹیا میں نہ پایا۔ ایک واقف کار بندر نے، جو پاس [illegible]

کی تلاش میں جنوب کو [illegible] قریبی قیاس نہیں)۔ [illegible] ہنومان کی سرکردگی میں [illegible] لنکا کو فتح کر [illegible] رام چندر اور ہنومان کی [illegible] خونریزی [illegible] بعد رام چندر [illegible] کی مدد [illegible] ہنومان اینڈ کمپنی سیدھے ایودھیا [illegible] کیونکہ رام چندر جی کے بن باس کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ [illegible] اپنا استعفیٰ بھجوا دیا اور رام چندر کی ایودھیا میں جوبلی کی پیشکش قبول کر لی۔

راجا دسرتھ [illegible] زندہ تھا مگر [illegible] ریٹائر ہو چکا تھا [illegible] کسی وبا میں مر گئے تھے۔ راجا بھرت نے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے راج پاٹ فوراً رام چندر جی [illegible] اپنی پاکدامنی کا ثبوت دینے کے لیے جلتی چتا پر [illegible] جنگل میں [illegible] وہاں ان کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے، جو آشرم میں ہی پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ مگر رام چندر جی کے دل سے شک دور نہ ہوا، اور انہوں نے ایک عرصے تک انہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کیا۔ یہاں وہ داستان رام کی قلم "سیتا" ختم ہو جاتی ہے۔

[illegible] فاسد ہی تھیں۔

[illegible] لاہور

رام چندر کے جڑواں بیٹوں میں سے جس کا نام لاہو تھا، لاہور شہر کی بنیاد رکھی۔ جو اب تک [illegible] موجود ہے۔ لاہو نے [illegible] کام سیکھا تھا اور کافی ماہر لوہار تھے۔ بعد میں بہت سے دوسرے لوہار اس شہر میں آن آباد ہوئے، اور لوہے کی بھٹیاں جگہ جگہ سلگنے لگیں۔

آج کل یہ شہر اپنے لوہے کے کارخانوں کے لیے مشہور ہے۔

Scanned with CamScanner

کرشن جی مہاراج، کورو پانڈو وغیرہ

اس واقعہ کے (یعنی رام چندر جی کے بن باس سے لوٹنے کے) سو ڈیڑھ سو برس بعد کوروؤں اور پانڈوؤں نے کوروکشیتر کے میدان کو چنا اور وسیع پیمانے پر وہاں ایک بڑی جنگ [illegible] میں) لڑنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ وہ کزن تھے۔ کورو سو بھائی تھے جو مہاراجہ دھرت راشٹر کے بیٹے تھے (دھرت راشٹر کے سو بیٹے اور بھی تھے، لیکن ہمیں ان سے واسطہ نہیں)۔ پانڈو صرف پانچ بھائی تھے۔ دھرت راشٹر کے بھائی پانڈو کی اولاد۔ اندھا ہونے کی وجہ سے دھرت راشٹر کو حکومت کرنے میں دقت ہوتی [illegible] ایک [illegible] چلے گئے اور سنیاس لے لیا۔ پانڈو کے پانچ بیٹوں کے نام یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکول اور سہدیو تھے۔ جب پانڈو مر گئے تو دھرت راشٹر نے پانچوں بچے اپنے پاس ہستناپور میں بلا لیے۔ [illegible] بڑے بیٹے یدھشٹر جی [illegible] مگر اس کے کزن دریودھن کو یہ بات پسند نہ تھی اور اس نے پانڈو برادران کے خلاف سازش کی۔ (دریودھن اچھا آدمی نہیں تھا)۔ جان بچانے کی خاطر پانچوں پانڈو بھائی اور ملک چھوڑ کر کہیں بھیس بدل کر قسمت آزمائی کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ پھر راجہ پنچالاس کے دربار میں ارجن نے سوئمبر میں راج کماری دروپدی جیت لی اور چونکہ پانچوں بھائیوں میں آپس میں بڑی محبت تھی انہوں نے اسے اپنی ساجھی بیوی بنا لیا۔ (ہم اسے اچھا نہیں سمجھتے اور دوسروں کو ان کی تقلید کرنے کا مشورہ ہرگز نہیں دیں گے)۔ یہیں ان کی ملاقات کرشن جی مہاراج سے ہوئی جو گجرات کاٹھیاواڑ کے راجا تھے اور سوئمبر میں حصہ لینے آئے ہوئے تھے [illegible] اپدیشک ضرور تھے۔ سوئمبر میں اپنی ناکامی پر یا پانڈوؤں کو برے حال دیکھ کر، اُن کی مدد بھری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھی سمجھدار آدمیوں سے [illegible] پانڈوؤں کو ان کی باتیں بڑی اچھی لگیں اور وہ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ کچھ مدت کے بعد اندھے دھرت راشٹر نے اپنے بھتیجوں کو ہستناپور واپس بلا لیا۔ اس نے راج پاٹ تج کر سلطنت کو اپنے بیٹوں کوروؤں اور بھتیجوں پانڈوؤں میں برابر برابر بانٹ دیا۔ پانڈو برادران نے دہلی کے نزدیک ایک نئی راجدھانی اندرپرست بنا لی اور ہنسی خوشی راج کرنے لگے۔

لیکن دھرت راشٹر کے بیٹے اپنے باپ کے اس فیصلے پر خوش نہیں تھے اور بڑے بیٹے دریودھن نے (وہ بالکل اچھا آدمی نہیں تھا) پانڈوؤں کے بڑے بھائی یدھشٹر کو چوسر کے میچ کی دعوت دی۔ اپنے مکار ماموں شکونی کی چالبازی سے جو قماربازی کے سب داؤ پیچ جانتا تھا اس نے یدھشٹر سے اس کی ساری سلطنت جیت لی، بھائیوں اور مشترکہ بیوی دروپدی سمیت۔ (ہماری رائے میں یدھشٹر نے جوئے کی دعوت قبول کر کے سخت حماقت کی اور پھر بھائیوں اور دروپدی کو داؤ پر لگانے کی [illegible] ضرورت [illegible] دیکھنا)۔ [illegible] کوروؤں اور پانڈوؤں میں اس بات پر سمجھوتا ہو گیا کہ پانچوں بھائی اور دروپدی تیرہ سال کے لیے ملک بدر ہو جائیں گے، اور اس کے بعد واپسی پر ان کی سلطنت ان کو سونپ دی جائے گی۔

پانڈوؤں نے یہی جلاوطنی کے تیرہ برس اپنے رفیق اور ہمسوار کرشن جی مہاراج کی صحبت میں بسر کیے۔ مگر یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ راجہ وغیرہ کچھ نہیں تھے بلکہ گوالوں کے ایک گاؤں کے مکھیا یا نمبردار تھے۔ [illegible] (جو اپنے کہنے کے مطابق وہ تھے) وہ ان کے سامنے یوں نہ سکے۔ کرشن جی مہاراج نے ان کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ ان کو دودھ کے بھرے کٹورے پلاتے اور ہرن کا گوشت کھلاتے۔ اس خوراک سے یدھشٹر صاحب بہت موٹے اور کاہل ہو گئے۔ باقی بھائیوں کی صحت بہتر ہو گئی (وہ شکار وغیرہ کھیلتے تھے) اور دروپدی کا رنگ روپ نکھر آیا۔ تیرہ برس ہو چکنے کے بعد انہوں نے دریودھن کو سندیسا بھیجا کہ بھائی جی تیرہ برس پورے ہوئے، ہماری سلطنت ہمیں واپس کرو۔ بدبخت دریودھن نے چپ سادھی اور کوئی جواب نہ دیا۔ تب پانڈو برادران نے جنگ کی تیاری کی اور کرشن جی مہاراج نے جو اچھے [illegible] دوسروں کے معاملات میں [illegible] کے خواہاں تھے، ان کی ہمت بندھائی۔ پانڈوؤں کے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں میں اپنے بہت سے دوست تھے اور وہ ایک بڑا لشکر جمع کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس اثنا میں دریودھن اور اس کے بھائیوں نے بھی فوج تیار کر لی۔ ہندوستان کے سب بادشاہوں [illegible] ایک یا دوسرے فریق کا ساتھ دیا۔ کوروکشیتر کے میدان میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہو گئے۔ ارجن کا دل اپنے عزیزوں کے ساتھ جنگ کرنے پر ملول تھا۔ اور وہ کچھ ڈانواں ڈول تھا۔ مگر کرشن جی مہاراج نے [illegible] کی فوج کا [illegible] کا معائنہ کیا اور ان کی سلامی لی۔ اس دوران وہ ارجن کو متواتر اپنا بھاشن دیتے رہے۔ اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ایک خطبہ [illegible] بعد میں یہ بھاشن بھگوت گیتا کے نام سے مشہور خواص و عوام ہوا۔ [illegible] فوراً بعد جنگ شروع کر دی گئی۔ گھمسان کا رن پڑا، کشتوں کے پشتے لگ گئے [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ یہ جنگ جو مہابھارت کی جنگ عظیم بھی کہلاتی ہے اٹھارہ دن تک جاری رہی۔ [illegible] صرف پانچ پانڈو بھائی اور کرشن جی مہاراج بچے (ویسے کرشن جی مہاراج [illegible] کے بعد [illegible] میں چلے گئے تھے اور انہوں نے جنگ میں براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا کہ کہیں کورو [illegible] کوروؤں سے بھی [illegible] تھے)۔ [illegible] پانڈوؤں کو فتح ہوئی۔ یدھشٹر تخت پر [illegible] ہوئے اور وہ اور ان کے بھائی مدت تک امن و شانتی سے راج کرتے رہے۔ کرشن جی مہاراج کچھ عرصہ اندرپرست میں رہ کر اپنے گاؤں لوٹ گئے (ارجن کی رتھ میں)، جہاں ان کی گوپیاں ان کی راہ تک رہی تھیں۔

اس جنگ کے بعد جس میں طرفین کے لاکھوں سورما کام آئے، ہندوستان میں بڑی مدت تک کوئی اور جنگ نہیں ہوئی (کیونکہ سورماؤں کی اور آلات حرب و ضرب کی شدید قلت ہو گئی تھی) اور ایسا امن و امان پھر ہندوستان میں کبھی نہیں ہوا۔

Scanned with CamScanner

ٹیسٹ پیپر ۱

کل نمبر ۱۰۰

(مہا بھارت کے دو سو برس بعد تک)

[illegible] پچاس روپے کے پوسٹل [illegible] ضرورت نہیں۔ [illegible] (پہلا ٹیسٹ پیپر) کی [illegible] ارسال کر دی جائیں گی۔

۱ [illegible] کسی [illegible] نہیں ہو سکا؟ بچوں اور لڑکوں کے علاوہ [illegible] کے سب لوگ (صرف مرد) داڑھی رکھتے تھے اور (بالائی لب) مونچھ منڈواتے تھے اس کی کوئی خاص وجہ؟

۲ [illegible]

۳ [illegible] والوں کی جنسی زندگی کے بارے میں دل کھول کر برملا تین یا چار صفحات کا جو یہ مضمون لکھو۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴ - وادیٔ سندھ کے لوگ گھوڑوں کی پرورش کے خلاف کیوں تھے حالانکہ دوسرے حیوانات ان کو پسند تھے؟ بھارت میں گھوڑوں کے مشتق کیا رائے ہے؟ کیا ان کو ہونا چاہیے؟

۵ - موہن جو دڑو میں برہنہ رقاصہ کی جو کانسی کی مورتی دستیاب ہوئی ہے اس کی اناٹومی پر بالتفصیل اظہار خیال کرو۔

۶ - رام چندر جی اگر راجا دسرتھ کی بجائے کنس اور راجا کے بیٹے ہوتے تو کیا اتنی جلدی بن [illegible] (شادی شدہ) کا بھی حال ہوتا ہے؟

۷ - کیا راون حقیقی راکھشس تھا؟ لنکا کا راجا ہونے کی وجہ سے اس کی بے شمار اپنی بیویاں [illegible] کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ راون کی خلاقی حالت کا تجزیہ کرو۔

۸ - جو [illegible] (تہاری [illegible]) [illegible] وجہ سے [illegible] کارناموں پر روشنی ڈالو۔

۹ - کیا [illegible] مختصر لکھو۔

۱۰ - [illegible] مہا بھارت [illegible] حمایت کرتا ہے؟ بیشک سنسکرت میں جواب دو۔

۱۱ - پانچوں پانڈو [illegible] مناسب ہے؟ [illegible] کر رہا ہے؟

۱۲ - [illegible] اور نقصانات بیان کرو۔

دوسرے ضروری ہوتے ایک وقت میں [illegible] دوبارہ سہ بارہ پڑھو۔

انتخاب

اکرم [illegible]

[illegible]

سوا نیزے پر سورج

Scanned with CamScanner

اکرام اللہ

ملتان میں پیدا ہوئے، پوری ... کہانی سے وابستہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "جنگل" جدید اردو کہانی سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک خوش گوار حیرت کا سبب بنا۔ ایک ناول "گرگ شب" لاہور سے شائع ہوا اور کچھ عرصے بعد ضبط کر لیا گیا۔ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

اکرام اللہ

سوا نیزے پر سورج

صاف شفاف دھوپ میں دونوں طرف حد نظر تک شبنم میں ڈھیر بھرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے سرین شیشم اور کیکر کے درختوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی سے چلی جا رہی تھی۔ دور کہیں کہیں کھجور کا کوئی پیڑ جو آسمان کی طرف لمبا کھنچتا چلا گیا تھا نظر آ کر گم جاتا۔ ہم سامان لادے ہوئے ٹھٹھے مشکوں پر ٹیڑھے میڑھے بیٹھے رہے تھے۔ ایک ہی شہر میں مسلسل رہے۔ جھلستی لو کھاتے، چلچلاتی دھوپ جھیلتے، پگھلتی کولتار والی سڑکوں پر چھت سے چاند یوں تک کالے پردوں میں بسے تانگوں کی بانسلیوں پر ساقب گرمی کرتے مایوس ہو کر ہم سے ہمار پر جانے کی ٹھانی تھی۔ تانگوں کے پردوں میں بند لڑکیوں اور عورتوں کے سر کبھی کبھی پھدکتے نظر آ جاتے جیسے کبوتر کی تھیلا کا پنجروں میں بند بٹیروں کی طرح پھدکے جو پنجرے کی کوریوں سے ٹکر مار لیتے جنہیں بٹیروں کی ہر طرف کی شانیں پیے ہاتھوں میں سکائے سڑکوں پر ہر صبح و شام عام گھوم رہے ہوتے۔ قسمت کبھی یاوری کر جاتی تو پردے میں ہوا دانستہ کیے گئے مہین سوراخ میں سے ایک خوفزدہ بھنورا سی کالی آنکھ باہر جھانک رہی ہوتی جو کچھ دیر تو ڈھٹائی سے ہماری بھوکی نظروں کی تاب لاتی اور پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ باوجود اتنی مشقت کے ہم نے ان پردوں میں سے پورا چہرہ تو کیا بھنورا سی کالی آنکھ بھی کبھی پوری نہ دیکھی) اور یہ بھی کبھی پتا نہ چل سکا کہ دیکھنے والی کی وہ آنکھ جاتی تھی کہ باہنی تانگے کی پھر پر بیٹھا ہیبت ناک مونچھوں والا کوچوان دسک چلا رہا ہوتا۔ سے نشست پر بیٹھنے کی جرات نہ تھی۔ چاہے تانگے میں ایک ہی سواری کیوں نہ ہو اور وہ بھی پچھلی نشست پر بیٹھی ہو۔ پیچھے پائیدان کے پاس، پردے سے باہر، فرش پر ایک چھوٹی سی غلیظ سوکڑی الٹی پالتی مارے بیٹھی ہوتی۔ اس کے ہمیشہ میلے بدرنگ کپڑے ہوتے اور سر پہ ڈھول مٹی سے اٹے بالوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہوتا۔ وہ پسے حیاتوں میں کم پہ بیٹھی کہاں رہی ہوتی۔ شدید گرمی سے بےحال ایک ہانپتا کانپتا مظلوم گھوڑا اس سارے بوجھ کو کھینچتا جا رہا ہوتا جس بوجھ کا بس میں دور کا بھی کوئی سمجھنا نظر نہ آتا ... میں سے ہر ایک ... سی بک کر جا رہا ہوتا

Scanned with CamScanner

مگر لگتا کہ ان میں سے ہر ایک کی منزل الگ الگ ہے وہ قریب قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہوں۔ شاید اصل حقیقت بھی یہی ہی تھی۔

ہمارے شہر میں گرمی کی غیر معمولی تیزی اور تیکھے پن کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے [illegible]

ان کا بیان زمین یہ [illegible] والا بھاری گھیر کا تنگ سا پاجامہ ہوتا۔ [illegible]

گلی کے دونوں طرف چادر بند کر کے تانگے کی طرف پیٹھ کیے پردے کریں۔ گلی میں چلتے راہگیر انہیں قدموں پر رک کر انتظار کرتے جب تک بیبیاں حویلی کے اندر نہ پہنچ جائیں۔ [illegible] ہوئے سڑک یا گلی میں نکل جاتے جیسے کوئی آفت نازل ہو گئی ہو۔ پھاٹک بند کیا جاتا۔ [illegible]

مہاری [illegible]

[illegible]

بیچاری [illegible]

ڈگ ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ گاڑی پل پر سے گزر رہی تھی۔ [illegible]

[illegible]

موم نے بتایا، "ایک زمانہ تھا جب نیل کی نذر ہر سال مصر کی خوبصورت ترین کنواری لڑکی کی جاتی تھی۔"

فیروزہ نے زبان پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "ارے احمق! پہلے بتاتا ہوتا تو میں آج اپنے ملک کا

خوبصورت ترین کنوارا لڑکا "چوزہ" مع اس کی اژدہا جیسی پشت کے [illegible] دریا کی نذر کرتا۔"

[illegible]

[illegible] مجھے پتہ ہے تیری جیب میں کچھ تانبے کے پیسے بھی تھے وہ بھی پھینک دے؟"

"ہاں۔"

زاغ نے اٹھ کے جا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا، "میری جان، تو نے برا کیا۔"

چوزے کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں پریشانی سے زاغ کے چہرے پہ گڑی تھیں، "مگر اس میں برائی کیا تھی؟"

"تو نے چاندی کی بجائے تانبا پھینک کر کے دریا کا اپمان کیا ہے۔ اب وہ بدلہ لے گا۔"

[illegible] پہ گویا چین سا آ گیا۔

[illegible]

میدان میں لڑ رہا تھا۔ آخر اس کو بھی تیز ہونا پڑا۔ خنجر سے لڑتے لڑتے پلٹ کر مخالف سمت پر [illegible]

[illegible]

لیکن جذباتی [illegible] کا معاملہ [illegible]

[illegible]

خچر صرف ایک [illegible]

[illegible]

"تم دو [illegible]" [illegible] "تم لوگ کھیلو گے؟"

"ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف بیس بیس روپے ہیں۔ اگر یہ واپسی کا ٹکٹ تو ہے۔ لیکن راستے کا خرچ [illegible]

گئی تو پردیس میں کیا کریں گے؟"

"ٹھیک بات کہہ رہے ہو۔ تم یہ کہو۔ لیکن میرے پاس بھر تم جانتے ہو صرف بیس ہی روپے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

سے زیادہ چمکنے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک بڑی طاقت سے لپک لپک لہرانے لگیں۔

"دیکھو" دنیا میں چانس ہے [illegible]

[illegible]

جوڑے نے پوچھا "کیا خیال ہے یوم؟"

یوم نے کہا "ٹھیک ہے۔"

[illegible]

راج نے کہا "پہلے کھیل کی شرائط طے کر لو تاکہ بعد میں چخ چخ نہ ہو۔ ایک آنہ پوائنٹ ٹھیک ہے؟"

[illegible] "ٹھیک ہے؟"

خچر نے کہا، "دو آنے لازمی [illegible] لیکن چار آنے سے زیادہ نہیں؟"

"ٹھیک ہے۔"

[illegible]

"ہاں! رکھو' رکھو۔"

"سادہ پہ چار چار آنے اور تصویروں والی پر آٹھ آٹھ آنے۔"

خچر نے کہا، "یہ زیادہ ہے [illegible] چار آنے رکھو۔"

[illegible] کہا "چھوڑ یار [illegible] دیکھی جائے گا جو ہو گا" یوم نے [illegible] Fatalistic اور Reckless [illegible]

Scanned with CamScanner

چوہے کی طرف دیکھا۔ اس نے [illegible] کر [illegible] شہر کی [illegible] سے لگ ہو کر [illegible] سگریٹ سلگایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان [illegible] چوہدری [illegible] کے [illegible] نہیں [illegible] ہو کر پھر کہ ہو [illegible] ریت کی [illegible] ہوا میں [illegible] محسوس ہونے لگی تھی۔ [illegible] کا وہ چہرہ سا [illegible] ہمارے [illegible] ہمارے [illegible] کے مصرف میں [illegible] باہر [illegible] دو [illegible] کی [illegible] سے [illegible] ہوئے [illegible] وغیرہ کو [illegible] بند تھیں۔ ہمیشہ [illegible] شاید وہ یہی حیثیت سے زیادہ [illegible] اس لیے [illegible] ہو گیا تھا اور [illegible] سے معذور تھا۔ [illegible] کپڑوں اور گرم کوٹوں سے [illegible] فرش پہ بکھرے ہوئے تھے [illegible] ہوئی [illegible] ادھر بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ [illegible] بستر [illegible] کو [illegible] چہرہ [illegible] کر [illegible] کھڑکی [illegible] جیسے کبھی بھی زندگی سے [illegible] ہو۔ [illegible] پوری [illegible] مستقل [illegible] سے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] ہو۔

چوہے نے کہا، "آؤ چوہے [illegible] میرے پاس بیٹھو، اور جیسے نوجوان کسی زمانے میں [illegible] پر ہاتھ رکھا کرتے ہیں [illegible] میرے کندھے پر [illegible] دیکھو [illegible] کیسے ہمدرد [illegible] ہوں؟"

چوہے مسکرایا اور اس کی موٹی گالوں میں گرمی ذرا اور گہری ہو کر زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ وہ [illegible] کو چوہے کی [illegible] ہو کر ہنسی ہنسی میں [illegible] اس کے کندھے سے جڑا کر بیٹھ گیا اور [illegible] سے اس کی [illegible] دیکھنے لگا۔

زاغ نے کہا، "میرے جانی ادھر آ کر میرے پاس بیٹھو اور بس میری ران پر ہاتھ رکھ کر [illegible] ہاتھ بھی جیسے [illegible]"

چوہے کا چوہے سے مذاق ہوم کو معصوم سی [illegible] نظر آیا۔ وہ دل میں مسکرایا اور عجیب طرح کے تفاخر سے اس کا سر ذرا سا اونچا ہو گیا لیکن زاغ کی [illegible] مذاق سے [illegible] کر [illegible] اور پھر [illegible] اور [illegible] گئی۔

خرگوش نے کہا، "آؤ چوہے، وہیں بیٹھے رہنا۔ چوہے تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ زاغ [illegible] کیا [illegible] نہ ہوئی؟"

[illegible] بادشاہ اور [illegible] تھے۔ اس پر [illegible] سے [illegible] اگر [illegible] ہوں [illegible] بادشاہوں [illegible] کالے [illegible]

[illegible] تو [illegible] شکست [illegible] ہیں، اور اگر ساتھ ہی اکثریت میں بھی ہوں تو پھر تو [illegible] کر [illegible] ہیں۔ [illegible] زندگی کا [illegible] پھیلایا ہوا تھا۔

ہوم کہنے لگا،

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

چوہے بولا، "ہوم یار تو وہیں اٹکا ہوا ہے کہ فارسی کے شعر کا رہا ہے؟ ادھر کو ذرا بازی کا رنگ ڈھنگ دیکھو۔ میری اسی [illegible] ہوم [illegible] سیدھا سادا اُلّو بھی کہا جا سکتا تھا۔"

ہوم نے کہا، "یہ شعر اردو کا ہے فارسی کا نہیں۔"

چوہے نے حقارت سے کہا، "کوئی بات نہیں پیارے۔ اردو، فارسی، ایک ہی بات ہے۔"

چوہے اردو، فارسی سے یکسر نابلد تھا۔ وہ [illegible] مادری زبان [illegible] بول سکتا تھا یا پھر انگریزی۔ اور وہ بھی [illegible] سکول [illegible] کہ [illegible] ہوں گے [illegible] انگریزی [illegible] باپ [illegible] ملازمت [illegible] سے [illegible] کر [illegible] شہر میں [illegible] کی [illegible] ہو گئی [illegible] کبھی [illegible] محسوس کرتے تھے جیسے [illegible] سے فرش پر آ رہے ہوں۔

چوہے ہوم سے کہہ رہا تھا، "ویسے سنا ہے ایرانی اُلّو، پاکستانی اُلّو سے سائز میں بڑا اور [illegible] میں کم ہوتا ہے۔ اسی لیے تجھ سے رعایت برتتے ہوئے میرا قدم ہوم رکھ گیا تھا۔ [illegible] تو بالکل ہی [illegible] ہو گیا ہے۔"

چوہے نے خرگوش کے سامنے پڑا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ سلگایا، ایک چوہے کو پیش کیا اور ہوم کو آواز دی۔

"آ، تو بھی یہ مشترک سگریٹ پی لے اس کے دل میں اتنی برکت ہے کہ چار گھنٹے تک پھر طلب نہ ہو گی۔"

ہوم نے انکار میں ہاتھ اٹھایا اور کھڑکی میں سر رکھے، آنکھیں بند کیے کسی میں محو رہا۔ خرگوش نے پیکٹ [illegible] جیب میں رکھ لیا۔ چوہے نے [illegible] ہوئے پوچھا، "[illegible]؟" [illegible] پیکٹ [illegible] میں [illegible] کہو تو حاضر [illegible] ہیں۔ [illegible] تو ذرا [illegible] کی [illegible] کر گیا، ورنہ اور تو کوئی بات نہیں۔"

خرگوش نے بڑے اٹھاتے ہوئے زور سے کہا، "سگریٹ اپنے اپنے۔"

چوہے دوسروں کی جیب سے سگریٹ پینے کا ماہر تھا۔ کالج کینٹین میں کبھی بھولے سے پیکٹ لے آتا تو ایک سگریٹ سلگا کر ذرا لاپرواہی سے کھڑا کر کے میں پھینک دیتا۔ جیسے حاتم ہو [illegible] وقت دوسروں کے لطف و کرم سے محروم ہونے [illegible] وقت [illegible] کی [illegible] بھی میری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئی یہ جیسے جیسے چلتی، چاپ کرتی لگنے لگیں۔ گاڑی کی چھت سے [illegible] درمیانی درخت کی تنے جتنا موٹا بولان رنگ کا نل، جس سے انجن میں پانی بھرا جاتا ہے، پاس سے گزرا۔ ہم یہ جانتا کہ [illegible] مار رہا ہے۔ اس اسٹیشن سے پانی کا گھڑا ہی بھر لا۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اور قمیص کے دامن سے چہرے کا پسینا پونچھ کر اسی طرح وحشی [illegible] وقفے سے مگر اور رہی تھی، اب رونے کر کہیں سمجھ رہ گئی تھی۔

چترو نے پوچھا "زاغ! پانی ختم؟"

"بالکل ختم ہے۔"

چترو نے کہا "ہوم، یہ بڑا اسٹیشن معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پانی آسانی سے مل جائے گا اور [illegible] ہے؟" [illegible] بھر تھا۔ [illegible] اب کوئی [illegible]"

سب یوں برافروختہ دیکھ کر سب بدمزہ ہو گئے اور محفل پر خاموشی چھا گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے میلی کچیلی پکی اینٹوں کی عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دو نیلی وردی والے عمارت میں گھس گئے۔ ایک وردی والا چبوترے پر لگے آہنی شکنجوں کو اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے [illegible] درخت، جو بوبوں کے ہاتھ پاؤں جیسی [illegible] پر گھڑا [illegible] رہا تھا اور سایہ [illegible] فیزنٹ گرمی گرمی پکارتے ہوئے [illegible] جیجر [illegible] دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی پانی والا ہاتھ لیے [illegible] ایک بڑھیا، ایک ہاتھ سے بوجھل گھڑا گھسیٹتی، دوسرے ہاتھ میں [illegible] کا ہاتھ تھامے، اسے گھسیٹتی گاڑی کے ساتھ ساتھ [illegible] چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑھیا نے گٹھڑی جیجر کے پاؤں کے قریب رکھی تاکہ اس میں سوار ہو سکے۔ "پتر رات سے یہاں [illegible] بیٹھی ہے۔"

اندر سے سب یک زبان بولے "مت چڑھیں یہاں۔"

جیجر نے گٹھڑی پاؤں سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "مائی آگے چل، یہ فوجیوں کا ڈبا ہے۔"

[illegible]

حق کی حیثیت اختیار کر کے معاشرہ میں پوری طرح جذب ہو چکا تھا۔ اور مخصوص تعصبات جو [illegible] شامل تھے، ان کے ہاں یہ استحقاق جنگ ختم ہوتے ہی اپنے آپ کالعدم ہو چکا تھا۔

مائی نے گٹھڑی اٹھاتے ہوئے پھر منت کی "پر گاڑی میں ہر ڈبا فوجیوں کا ہی ہوتا ہے۔ راستے میں کچھ ہو رہا ہے [illegible]"

چترو [illegible] سے بولا "آگے چل مائی، آگے۔"

وہ گھڑا [illegible] کی طرف لپکی اور [illegible]

[illegible]

زاغ نے فورسوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "تو عجیب جذباتی آدمی ہے یوں رحم کھانے لگتا [illegible] کیا تو معصیت ہو جاتی کی اور ہماری آزادی الگ برباد ہو گئی۔"

چوہدری نے کہا "ان دو بڑھیوں سے کیا فرق پڑتا تھا؟ ایک کونے میں بیٹھی رہتیں۔"

چترو نے کہا "اب اس بحث سے کیا فائدہ؟ [illegible] چلو کھیل شروع کریں۔"

فیزنٹ نے نعرہ بلند کیا "ارگرا چاہیے [illegible] اسٹیشن پہ پانی کا [illegible]"

چترو نے تجویز کیا "جیجر پہلا ہاتھ مارے وہ گھڑا بھر کے لائے۔" [illegible] اس پر صاد کی۔

زاغ نے کہا "سوائے میرے۔"

"کیوں؟"

اس نے متانت سے عذر پیش کیا "کیونکہ یہ میرے وقار کے منافی ہے۔"

یہ جواب سن کر برہم، چترو، جیجر اور چوہدری حیران سے ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ فیزنٹ اور جیجر [illegible] اس کی بات سمجھ [illegible] جو اس طرح وقار کا دعوا کرے۔

Scanned with CamScanner

چترجی صاحب ہوتے ہوئے کہا، "چلو یار، تاش تو ہاتھوں، خواہ مخواہ میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ابھی اسٹیشن دور ہے۔ جب چائے لانا ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

پہلا چائے کا دور آخر ہارا۔ کھیل جاری رہا۔ اسٹیشن قریب پہنچا تو کہا گیا "جی بھئی، ذرا گھوڑا سنبھال۔"

وہ بچی ہی کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی رکتے ہی فیرسٹ پلیٹ فارم سے ایک شیشم کی پتلی شاخ ہاتھ میں سمیٹ ہوئی۔ گر رہے تھے۔ اس نے شاخ گھماتے ہوئے رخ سے پوچھا "جانتی ہو یہ کیا ہے؟"

"نہیں؟"

ایک زمانے کی فیرسٹ نے اس کی سمجھ نہ دی۔ رخ کی دعوت کے اس علاج پر سبھی خوش تھے۔

"جانتی ہو؟"

"نہیں۔"

گرد سے ومل نظر آجر نے ہتھیلی سے گہرا تھپتھپا اور پاس بیٹھے دور کی فیرسٹ نے ایک اور کھینچ کر ویسی ہی اس کی تختیوں پر دھلا۔ اس نے ڈالی سے گرتی ہوئی چھڑی پکڑ لی۔

فیرسٹ نے جلال میں کہا "چھوڑ دو، چھوڑ دو۔ ورنہ ڈونل کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ کہ اصلی ڈونل ہو گی، اور موت تک۔ چاقو، چھری، جو چاہو ہتھیار منتخب کر لو۔"

رخ نے سب کی تیوری دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر ہنسی نہیں روک سکی۔ "کمال ہے یار، میں مذاق کر رہا تھا۔ تم لوگ خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔"

اتنے میں گاڑی کھسکنے لگی۔ دوڑتے ہوئے چترجی نے پہلے گھوڑا رکھا اور پھر ایک جست لگا کے ڈبے کے اندر پہنچا۔ وہ خوب ہنس رہا تھا۔ "حد ہو گئی یار!"

"کیا ہوا؟"

"ننگی پاؤں، جو گرم پلیٹ فارم پر جھلس گئے تھے۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر گیلے ہاتھوں سے سہلانے لگا۔ "بڑا مزہ آیا!"

"ہوا کیا؟"

"ایک بہت خوبصورت اور معصوم لڑکی نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے مجھے آواز دی۔"

"واقعی! کیا کہتی تھی؟" حسد سے سب کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔

"وہ اس گاڑی کی فرسٹ کلاس میں اپنے خاندان کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔"

"لڑکی پوچھو یہ بتا کہ اس نے کہا کیا؟"

"کہتی تھی اے سوڈے والے برف ہو گی؟"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ اور پھر ایک قہقہے سے رخ کی تیوری اور دلوں کی کدورت دھل کر بہہ گئی ہو۔

"لڑکی بہت ذہین ہے، اس نے مجھے ٹھیک پہچانا۔ خاکی نیکر، ننگے پاؤں، ننگا بدن، اور وہ بھی پسینہ میں ایک ڈبے میں ایک کاغذ لے کر سوڈا واٹر ہی سمجھا ہو گا۔" چترجی نے ہنس

رات بیت گئی۔ کھیل معطل تھا لیکن سامان بھی میز پر ہونے کی صورت میں بچھی تھی اور تاش کی گڈی درمیان میں ساکت پڑی تھی۔ کون جیتا اور کون ہارا اس بارے میں کوئی بات کھل کر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ بلند آواز میں بحث زوروں پر تھی۔ جیتنے والوں کی مخصوص عادت کے مطابق رخ اور سرجیت بہت فاتحانہ سی جیت تسلیم کر رہے تھے اور ہارنے والے قسمیں کھا کھا کر اپنی چھوٹی ہار کا اعلان کر رہے تھے۔ بوم نے چوڑے سے راز داری سے پوچھا، "کیا بنا؟"

اس نے ناک چڑھا کر کہا، "سب سالا لگتا ہے اپنی آخری قسط بھی ہار گیا ہے۔"

"ہو گیا اب اس حرامزادے کا طرح کون اٹھائے گا یار، تُو نے تو اسے منع کرنا تھا۔"

"ہارنے والا کب منع ہوتا ہے، اور پھر چترجی تم جانتے ہو، وہ جوئے کا ایک دھتی ہے۔"

چترجی ایک کونے میں کھڑا فیرسٹ کو اعتماد میں لے کر بتا رہا تھا "فلاش، چانس اور اسکل کا کھیل ہے۔ تمہیں پتا ہے، اسکل میں تو میں کسی سے کم نہیں ہوں، بلکہ زاج اور سرجیت میرا کیا مقابلہ کریں گے، لیکن سالا پتا ہی نہیں پڑا۔ پاس پیسہ کھلا ہو تو اس کھیل میں ہارنا ناممکن ہے۔ تم مجھے سو روپے دے دو تو تم پھر دیکھو کیسی درگت بناتا ہوں ان کی۔ میرے بینک میں کوئی دو ہزار سو روپے پڑے ہیں۔ جس دن واپس پہنچیں گے اسی دن سب سے پہلے سو روپے نکال کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ یہ پرامس۔ جوئے میں کھوئی ہوئی رقم صرف جوئے ہی کے ذریعے واپس آ سکتی ہے۔"

"بوم اور چوڑے نے بھی پانچ پانچ روپے نکالے تھے، وہ بھی نکل گئے۔ میں یہ ڈبل کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ اسی طرح میری بچت ہو سکتی ہے۔"

فیرسٹ نے حیرانی اور افسوس کی ملی جلی کیفیت کی تحت کہا "او تیرا خانہ خراب، بوم اور چوڑے کو بھی چھلوا دیا تُو نے! چل یہ لے دس روپے۔"

"دس روپے سے کیا ہو گا؟ پچاس تو دے!"

"اچھا یہ بیس پکڑ۔"

فیرسٹ نے دس دس کے دو نوٹ گن کر کے اس کی مٹھی میں تھما دیے۔ بازی پھر جم گئی۔ کھیل ہنسی ہنسی میں ایک نئے سے شروع ہو کر نہ جانے کب بورڈ تک پہنچ چکا تھا۔ ماحول میں سنسنی اور تناؤ ایسا شدید تھا کہ ہم بند ہوتی جاگتی آنکھوں سے اسے بڑھتا پھیلتا دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سب ایک کھسکتے ہوئے گلیشیر کے سامنے میں کھڑے ہوں۔ جہاں ایک ذرا سی بے احتیاطی اور اس قیامت خیز حرکت کو وجود میں لا سکتی ہو جو پل بھر میں مربع میل کے رقبے میں برف کا لڑھکتا ہوا عظیم تودہ مکمل تباہی و بربادی پھیلاتا ہوا پورے لینڈ سکیپ کو تہہ و بالا کر دے گا پھر اس علاقے میں کوئی ذی حس، کوئی جانور، کوئی انسان باقی نہ بچے گا۔ سب کچھ برف اور مٹی بن کے رہ جائیں گے۔ دوسری طرف صورت حالات یہ سی تھی کہ گویا ہر پتا ہاتھ میں بھرا پستول لیے چھپا ہے کہ موقع ملے تو چھٹ میں سے نکلے، "ٹھاہ" ہم کھڑا ہو کر پھسلوں۔ ہے اور پس پشت کے پردے میں جا چھپے۔ ہر کھلاڑی جیسے تلوار کی دھار پر چل رہا تھا۔ کسی کے صرف تین یا چار پتے بھی ملانے ہوں، شور جو کھیلنے والوں کی سانسوں کی دھڑکنوں سے پھسلتے ہوئے کھیل پہ گرتے تھے۔ گویا دن بھر کے تھکے کاسنی کے پردوں پر گرتے کہیں

کے دوران ہونے والی ہلکی پھلکی مار لگی کا اب وہاں کوئی مقدم نہ رہ گیا تھا۔ خطرہ کسی کی بھی تو کسی میں ہمت تھی اور نہ ہی کسی میں سہنے کی تاب تھی۔ تماشائی ارد گرد کھڑے تھے اور جو کچھ کھلاڑیوں کے لیے عجب سے ظہور میں [illegible] رہا تھا اور جو جلد ہی آنے والا تھا، اس کو اس کی تمام تر [illegible] سمیت دم سادھے ایک اشتیاق کی عالم میں دیکھ رہے تھے۔

چتر چلا کر تماشائیوں سے مخاطب ہوا، "یہ تم لوگ کیا سر پر سوار ہو گئے ہو؟ کوئی ادھر [illegible] دیکھتا ہے کوئی ادھر دیکھتا ہے۔ اس طرح ساری گیم منگی ہو جاتی ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اگر کچھ نہیں سوجھتا تو پرے بیٹھ کر جورے کر موسم لو۔ وقت گزاری کا اچھا مشغلہ ہے، میں رما چکا ہوں۔"

صرف تماشائی ہنسے۔ جورے نے کہا، "مراسی! ہکو من سے باز نہیں آتا۔"

حیور جھنجھلایا "چپ! تو پتی بانٹ۔ کیا فضول باتیں کر رہا ہے۔"

[illegible] نے سوٹ کیس کھول کر [illegible] نکالا۔ غسل خانے میں ڈھول [illegible] سے بھر منہ دھویا۔ بال سنوارے، کپڑوں سے مٹی جھاڑی۔ اور جیسے ہی گاڑی سٹیشن پہ رکی تو جورے سے کہا، "چل ذرا پلیٹ فارم پر ذرا چہل قدمی کر کے آئیں۔" وہ دونوں [illegible] سے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں ہوا [illegible]

کس نے موم بتا دیا؟ وہ تھرڈ کلاس والی لڑکی تلاش [illegible] تو یہاں بیٹھ مکھیاں مارتا رہیو۔ چل بھاگ۔" موم بھی ان کے پیچھے نکل گیا۔

گاڑی تیز ہو چکی تھی اور وہ [illegible] واپس سوار ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ فرش پر [illegible] اور چتر گتھم گتھا ہیں۔ [illegible] ایک طرف کھڑے [illegible]

[illegible]

میں [illegible]

"ہوا کیا؟"

[illegible] بولا "ہونا کیا تھا [illegible] چتر اور خیور ایسی میں مل گئے [illegible]

[illegible] چل رہی تھی۔"

چتر بولا "جھوٹ بولتا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

چتر جھٹک کہہ رہا ہے۔

فیرنٹ نے پوچھا، "پول کی رقم کس کے پاس ہے؟"

عرعیسے نے کہا "حیورے پاس ہے۔"

"نکالو۔ اب جھگڑا ختم۔ [illegible] چار برابر حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصہ سب کو دے دو۔ [illegible] کھانا شروع کریں۔"

[illegible] تمام [illegible] میں کچھ فرق ہو

[illegible]

اور پوسنگوں سا اندھیرا بھی پھیلا۔ لیکن چند [illegible] کہ سب [illegible] ہو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے لیے اندھا ہو جاتا۔

موم نے کہا، "یار خیور سوک دریافت خوب ہے۔"

"دیکھا تم لوگوں سے؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بھی عاشق ہوتا ہے یا نہیں۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نہ ہوا تھا، وہ لنگی اور [illegible] اور بہانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فیرنٹ نے اسے بلایا اور کہا، "اوئے، [illegible] کو ہیں [illegible]" موم اور چتر [illegible]

[illegible]

[illegible]

جگہ دے دے۔ فیرنٹ نے پھر کہا "اوئے سنا! چل جا اب!" [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ممکن نہ تھا۔ ایک آدھ دن بعد پوچھ ہی لیا "[illegible] پھر وہ سوری کو لایا؟"

Scanned with CamScanner

"کہ یہ کیا ہے؟"

مہر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "اس پر عاشق ہونے کا حق اگر کسی کو ہے تو وہ میں ہوں، لیکن افسوس کہ مجھے [illegible] دست بردار ہونا پڑ رہا ہے، کیونکہ وہ مجھے سوڈا بوتل والا سمجھتی ہے۔" پھر اس نے وینڈروں کی نقل اتارتے ہوئے لہجے میں [illegible] سوڈا [illegible] کی آواز لگا کے دکھائی۔

کچھ دیر تک تو یہ عاشقی کے دعوے‌دار اپنی اپنی فرقت کا راگ الاپتے رہے، پھر گرمی کی شدت اور کھانے کی غنودگی سے ان کی بے‌ربط باتیں ختم ہو گئیں، اور سب اُلٹے سیدھے، جہاں جس کو جگہ ملی، سیٹوں اور برتھوں پر بے‌سدھ گر گئے۔ جب نیند اکھڑی تو گاڑی چل رہی تھی اور گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ کھڑکیاں کھولی گئیں۔ فرش پر دھوئیں اور ریت کی تہہ جم چکی تھی۔ جس جس برتھ اور سیٹ پر کوئی سویا تھا، اس پہ مٹی کی تہہ کے درمیان اس کے بدن کا نقشہ سا ابھر آیا تھا۔ سر کے بال، بھنویں، پلکیں اور چہرے سب مٹی کا رنگ لیے ایک رنگ ہو چکے تھے۔ باہر ریت کے ٹیلوں پر [illegible] کی ایک لمبی قطار [illegible] قدموں سے [illegible] کو پیچھے دھکیلتے دور چلی جا رہی تھی [illegible] خالی [illegible] کھیتوں کی جانب [illegible] ڈھلتے سورج میں [illegible] کے ساتھ [illegible] ہو گئے تھے، اتنے بہت سے اونٹوں کے [illegible] سوار تھے [illegible] ریت کی چادر کی دھن میں [illegible] ان میں سے ایک کان پر ہاتھ رکھے تان لگا رہا تھا، جس کی آواز گاڑی کے شور میں دب کر ہم تک پہنچ نہیں رہی تھی، لیکن ہم [illegible] صحرا کی [illegible] کے گیتوں سے واقف تھے۔ شہر میں رہنے والوں کے [illegible] پر [illegible] پہنچا [illegible] کو شہر سے نکلنے اور اپنے گاؤں کی راہ پہ پڑنے تو شہر کی گھٹن اور نامانوس ماحول اور مالکوں کی کارندوں کی [illegible] کا احساس [illegible] کی [illegible] فریاد کے گیت، جدائی کی شعلوں کی سی لپک رکھنے والی راگنی [illegible] گائی [illegible] ان کے سینے سے ابھر کر دور دور تک اداسی پھیلاتے بکھر جاتے، ان گیتوں میں کبھی چاندنی میں صحرا کی لہر پر [illegible] ریت کے لاامتناہی سلسلے جیسے "کلاپ" کی دکھ بھری [illegible] محبوب کی [illegible] جذب ہو جانے کی [illegible] مجسم ہوتی۔ اندر ہی اندر کھا جانے والی [illegible] کا سوز [illegible] چھپ رہے ہوتے۔ خاموش ستارے، پیلا [illegible] چاند، خالی سڑک اور کھیتوں کی [illegible] دکھ کی ایک وسیع [illegible] میں [illegible] ان کے گیت میں بہتے چلے جا رہے ہوتے۔ یہ صرف کسی ایک شخص کا دکھ نہیں، بلکہ کائنات کا دکھ بیان کر رہا ہوتا جس کا ذرہ ذرہ مسرور ہے اور [illegible] حکم [illegible] حکم [illegible] میں [illegible] ہو کر [illegible] جائے۔ ہمارے [illegible] سے شیریں ہوتے ہیں جو گہرے دکھ کی بات سناتے ہیں۔

فیروز کہنے لگا، "یار! کسی طرح چائے کا انتظام ہونا چاہیے۔"

[illegible] کی [illegible] اور مطمئن ہو گئے کیونکہ ان کے گھروں میں ابھی چائے کا کوئی ایسا رواج نہ چلا تھا۔ شام کو صاحب [illegible] گھروں میں [illegible] کہا "اگلے اسٹیشن پر چائے کا ضرور انتظام ہو گا۔ یہ

حالانکہ ایسا بھی کیا گزرا نہیں ہو گا۔"

چتر ہنستے ہوئے بولا "فیروزا تمہیں چائے پلا دیں گے۔ یہ کون سی ایسی مشکل بات ہے۔ اسٹیشن پہ انتظام نہ بھی ہوا تو میں سائیں اسٹیشن ماسٹر کے گھر سے بنوا لاؤں گا۔ تم بس اتنا کرنا کہ جب گاڑی چلنے لگے تو زنجیر کھینچ دینا۔ آدھ گھنٹے [illegible] میں نکل جائے گی۔"

راغ بولا "اور پچاس روپے تیرا باپ دے گا؟" چتر کی اس تجویز پر دوسرے بھی گھبرائے کیونکہ وہ ایسا کر گزرنے والا آدمی تھا۔

"سائیں گھبراتے کیوں ہو؟ فیروزا دے گا۔ امیر آدمی ہے۔ اور پھر شوق بھی تو پورا کرنا ہے۔ اس کے سامنے پچاس روپے کی کیا حیثیت ہے؟ میرے پاس اگر ہوتے تو میں پہلے گارڈ کی ہتھیلی پر پچاس روپے رکھتا، پھر پلیٹ فارم سے باہر نکلتا۔"

فیروز بولا "چلو! چائے کی کوئی ایسی بھی خاص طلب نہیں۔ [illegible] گاڑی بڑے اسٹیشن تک جنکشن پہ بھی [illegible] رات آٹھ بجے تک پہنچ جائے گی۔ وہاں چائے سوڈا وغیرہ مل جائیں گے لیکن کھانا اچھا نہیں ملے گا۔ سوکھی روٹیاں، باسی دال اور بھینس کے گوشت کے کباب جو [illegible] دن پہلے کے ہوں گے۔ اگر تم سب [illegible] ہو تو اگلے اسٹیشن پر گارڈ کو کہہ کر تار دلوایا جا سکتا ہے کہ سات آدمیوں کے لیے جنکشن اسٹیشن پر [illegible] تیار ہو۔ پلاؤ، قورمہ، فیرنی سب کچھ ہو گا۔ ایک آدمی کا خرچہ بس یہی کوئی تین چار روپے تک اٹھے گا۔"

راغ اور [illegible] اس تجویز کو قبول کرنے میں بھلا کیا چیز مانع ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جھٹ اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔ چتر نے پہلے تو بغلیں جھانکیں، پھر مجبوراً چاروں کے ساتھ اس نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا اور کہا "ہم تو بھینس کے کباب ہی کھائیں گے کیونکہ ہم چاروں کو، جب موسم ایسا ہو جیسا کہ آج ہے تو بھینس کے کباب ہی مزا دیتے ہیں۔"

فیروز نے کہا "چلو چاروں کے پیسے میں دے دوں گا۔ تم تینوں تین تین روپے کے لیے کیوں مرتے ہو؟"

چاروں نے "تو ٹھیک ہے" کہتے ہوئے اس کی خصوصی پیشکش رد کر دی، اور اکثریت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ چتر بولا "او سائیں! بات تین تین روپے کی نہیں، کہو تو تیس تیس لا دیں، لیکن شرط صرف بیس بیس روپے ساتھ لانے کی تھی۔ تم لوگوں نے [illegible] اور زیادہ پیسے ساتھ لے آئے۔ ہمارے پاس معاہدے کے مطابق صرف بیس بیس روپے ہی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رقم میں یہ الّلے تلّلے نہیں ہو سکتے۔"

تھوڑی [illegible] غیر متوقع طور پر اپنا چہرہ [illegible] کیا کہ سب کو خوابوں کی دنیا سے کھینچ کر سخت زمین پہ لا پٹخا۔ ماحول پہ افسردگی اور اس کے ساتھ شرمندگی نے پھیل کر محفل پہ خاموشی طاری کر دی۔ وہ ایک عجیب طرح کی بےسکون اور تکلیف دہ خاموشی تھی۔ اب کہیں کہیں ریت کے ٹیلوں میں اکا دکا درخت سر نکال کے جھانکنے لگے۔ اس اداس شام میں اور بھی اداس [illegible] گیت [illegible] نکلے۔ دور ایک کچا سا کوٹھا کھڑا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ بریکیں لگنے سے پہیوں [illegible] کا ایک شور بلند ہوا۔ پھر دھڑام دھڑام سے [illegible] لوہے کی بھاری بھرکم [illegible] سے ٹکرائے۔ ہم نے گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد [illegible]

آواز بند ہو گئی۔

پتھر بولا: "اس پوری گاڑی میں صرف ایک حسینہ کی موجودگی ہماری نجات ہو گی۔ ہم سب چل کر اس کی زیارت کریں۔"

خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب کھڑے ہو گئے [illegible] کھڑے ہوئے۔

بوم بولا: "حسن بنا جان لو۔ حسین چہرے کی زیارت ہر کسی پر لازم ہے۔ کوئی بھول کر بھی دعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے ورنہ مصیبت بن جائے گی۔"

خرگوش بولا: "یار، تم ہمارے ساتھ یہ شاعری والی باتیں نہ کیا کرو۔"

خنجر ایسے [illegible] برف والی کا لباس اتارنے کے لیے جلدی جلدی پتلون قمیص پہن رہا تھا۔

زاغ بھیڑیے کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہنے لگا: "بوم، ہم سمجھتے ہیں حسن کا کیا مقام ہے لیکن ایسے اس چہرے سے بڑھ کر کیا حسین ہو گا۔"

[illegible] زاغ کے پیچھے [illegible] چہرے سے [illegible] کی کوشش کر رہا تھا۔ چل [illegible] چہرے [illegible] بند کر دیں، نہیں تو مخملی [illegible] دیا۔" بھیڑیا کمر بچا کر زاغ کے بازو سے باہر تھا۔

اس گاڑی کے اکلوتے فرسٹ کلاس ڈبے کے [illegible] میں چودہ پندرہ سال کی ایک جوان لڑکی، [illegible] معصوم آنکھوں سے [illegible] کے چہرے [illegible] سب پر [illegible] ویسے ہی چہرے [illegible] کا چھوٹا بھائی باہر دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے جب سات چہروں پہ نظر [illegible] اپنے بدن کو عجیب طرح تیرتی پتلیوں کو جلدی سے اس کا چہرہ اتر گیا۔ سہم کر اس نے دوپٹہ سیٹ [illegible] کے پہلو میں [illegible] کی طرف کھسک کر کے [illegible] سے پناہ کی [illegible] اور ہم ویسے ہی [illegible] اس [illegible] کے چہرے پر شدید [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] کا [illegible] ہے کہ یہ سات شخص مل کر [illegible] کے ساتھ کوئی [illegible] کر رہے ہیں [illegible] جرأت نہیں اس لیے ہو [illegible] کے [illegible] ہم یہ کرکے [illegible] رکھے ہوئے تھا لیکن [illegible] سے کچھ نہ ہو سکا۔ گھورتے [illegible] کی [illegible] اور کرسی سے [illegible] پر [illegible] کر [illegible] کی [illegible] کم وہاں تک دیکھ رہی ہوا [illegible] سے طرف [illegible] وہ [illegible] قدموں سے چل [illegible] کر [illegible] کے کنے میں [illegible] کی [illegible] میں [illegible] ہو گیا۔ لڑکی کے بدن کی [illegible] سے [illegible] تھا کہ وہ [illegible] کی کمر پر ہاتھ پھیرا [illegible] کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے [illegible] بھی گارڈ کو بلانا ہوگا۔" ہم [illegible] ہو کر [illegible] بھاگے۔ گاڑی چل پڑی اور چلتی رہی۔ لیکن ہم میں سے کسی کو بہت دیر تک [illegible] گھورنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں [illegible] رہا تھا کہ یہ [illegible] لڑکے [illegible] میں سے [illegible] ایک [illegible] یوسف [illegible] عشق و محبت کے [illegible] سے [illegible] کے لیے یہ [illegible] پیش کرنے کے لیے [illegible] میں یوسف [illegible] کی بجائے ایک خوفناک درندے کی شکل دیکھ کر [illegible]

یا شاید ہم تو صرف توجہ چاہتے تھے۔ مستی بھی زندہ ہونے کا شعور حاصل کرنے کے لیے ہم شاید [illegible] کی رو میں [illegible] روپیہ [illegible] کر گئے کہ دوسروں کو محبت کی [illegible] میں بھی [illegible] اور [illegible] اتنا کہ [illegible] خوف و [illegible] کے دریا میں ڈوب کر رہ گئے۔ خواہشات کے گھوڑے جب بے قابو ہو کر [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کو [illegible] کر لیں تو دیکھنے [illegible] جو کچھ دیکھتے ہیں وہ [illegible] کی آنکھوں کو نظر نہیں [illegible] کی [illegible] میں چڑیاں اسی طرح مر جایا کرتی ہیں۔

خنجر نے خاموشی توڑی: "میں اگر ابھی اس خاکی بیکر میں چلا جاتا تو وہ مجھ سے ضرور بات کرتی، چاہے وہ برف کی فرمائش ہی کیوں نہ ہوتی۔"

بوم بولا: "جب سات بھوکے جنگلی کتے منہ کھولے، منہ سے لتھڑی زبانیں لٹکا کر ایک بھیڑ کے بچے کے آگے کھڑے ہو جائیں گے تو یہی ہوگا جو ہوا۔"

زاغ نے جواب دیا: "سات بھوکے شیروں کو بھی تو گوشت چاہیے اور وہ بھیڑ کے بچے کے پاس ہو تو کب تک کیا جائے؟"

بھیڑیا بولا: "بوم یہ بات ان انسانوں کے بارے میں کہی ہے جو کتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ہم [illegible] ورنہ وہ بھیڑ کا بچہ [illegible] صرف [illegible] تھا جو [illegible] کی بجائے بہت [illegible] خوفناک صورت اختیار کر گیا۔"

لومڑ نے کہا: "ہم نے واقعی انہیں بلاوجہ ڈرا دیا۔ بہت برا کیا۔ سنسان علاقہ، اکیلی عورتیں، سخت مشتعل وہ ڈریں نہ تو اور کیا کریں؟"

خرگوش نے کہا: "چھوڑو یار اس قصے کو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب کوئی اور بات کرو۔ میری مصیبت تو یہی ہے کہ [illegible] کی صورت [illegible] اسے [illegible] کرو نہ کوئی [illegible] جھک جھک۔"

پتھر بولا: "تم لوگوں نے سمجھ بھی مایوس کیا ہے۔ سب کے سب بالکل الٹے ہو اور [illegible] کی [illegible] کبھی [illegible] بھی [illegible] ہے [illegible] کے دل میں ہمدردی پیدا کرو، پھر اس کا قرب حاصل کرو، پھر اس کی خدمت کرو، پھر اس کی عقل، ذہانت اور [illegible] کی تعریف کرو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ تمہاری طرف مائل ہو گی۔ پھر [illegible] میں جو تم [illegible] کی [illegible] مطلب ہے [illegible] داستانیں، سنائیں۔ اگر قسمت اچھی ہو تو وہ [illegible] ہے اس طرح سے اگر لڑکیاں [illegible] لگیں تو سارا جھگڑا ہی نہ [illegible] جائے۔ میں بھی تم لوگوں کا جوش و جذبہ دیکھ کر [illegible] میں [illegible] اس لڑکی سے کبھی ملاقات ہو بھی گئی تو وہ مجھ سے کہاں پھنسے گی۔"

زاغ چمکا: "یہ بگلا پکڑنے کی ترکیب ہے سنبھال کے اپنے پاس رکھیں۔ اور یہ بھی آپ کا خام خیال ہے کہ پھر کبھی آپ اس سے مل پائیں گے۔ اور بدقسمتی سے اگر مل بھی گئی تو حضور کی صورت پرنور کیا اسے یاد رہے گی؟"

اسٹیشن آتے رہے، گاڑی رکتی رہی اور چلتی رہی لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ کسی اسٹیشن پر اتر کر اس ڈبے کی طرف منہ کر سکے۔

جنکشن اسٹیشن آ گیا۔ [illegible]

[illegible]

"ہاں۔"

"اسے فوراً باہر نکال لیں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس بوگی کی بریکیں خراب ہو گئی ہیں۔ یہ آگے نہیں جا سکتی۔ یہیں کٹ جائے گی۔"

"تو ہماری بوگی کہاں ہے؟"

"نئی بوگی نہیں ہے۔ سامان اٹھائیں اور اگر سفر کرنا ہے تو گاڑی کے کسی اور ڈبے میں جائیں۔"

[illegible]

زاغ نے اپنا بستر اور سوٹ کیس جھٹ سے نکالا، اور یوں سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے ہمارے ساتھ نہ ہو۔

"بھائی یہاں کوئی قلی مل جائے گا؟"

ایک ریلوے وردی والے نے نہایت روکھے انداز میں کہا "یہاں کوئی قلی ولی نہیں ہوتا۔ جلدی کرو اور سامان نکالو۔"

[illegible]

سامان اس ڈبے کو جیسے ہم اب تک پتا نہیں کیوں اپنا حق اور مقدر سمجھ چکے تھے۔ [illegible]

[illegible] پتا تھا کہ اگر وہیں نہ گھس پائے تو گاڑی سے رہ جائیں گے۔

[illegible]

شہزور نے پوچھا "زاغ کہاں ہے؟"

پتر بولا "ہو گا یہاں کسی ڈبے میں۔"

طرحدار نے کہا، "آپ گاڑی کہیں رکے تو اسے تلاش کریں۔"

پتر بولا "چھوڑو۔ صبح دیکھیں گے۔"

[illegible]

چوزہ بولا: "میں نے پہچان لیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

[illegible]

کچھ جگہ بنی ہو ہم نے یہ اصرار قیمت اور جرعے سے کہ میں دو سروں سے زیادہ پر مشقت زندگی کے عادی تھے وہاں سو گئے۔ جرعے نے کہا "اب تو رات کو بھی نیند نہیں آتی۔ وہ پتا نہیں کیسا کہاں خراب ہو رہا ہو گا۔"

ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو چائے پیتے ہوئے کچھ اتر گیا کہ "ابھی آتا ہوں۔"

واپس آیا تو بتایا کہ "میں شک درست تھا۔ رات میرے خان پر سیکنڈ کلاس کی برتھ پر بستر جمائے پنکھے کی ہوا میں سو رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ تو کہنے لگا ساری رات کی بے آرامی کون برداشت کرے۔"

جرعے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حیرت سے بولا "میں جانتا ہوں وہ بڑا چھوٹا اور کمینہ آدمی ہے۔ آج سے بیس چار سال پہلے تک بازار والوں نے مرغیوں کی قیمت ایک جوڑا کبوتر مقرر کی تھی اور قادو خان پہلوان کے ہم بدمعاش سے شاگرد سے لے لیا کرتے تھے۔ وہ یوں سالہ نہ چھوڑتا تو اور کون چھوڑتا۔"

قادو خان پہلوان بھی اپنی ذات میں ایک مکتب فکر تھے۔ جوانی میں بہت شہ زور اور نامور پہلوان رہا تھا۔ پھر عیاشی میں پڑ گیا اور لڑکیوں کی جنبش نے چند سالوں کے اندر اندر پیچ تاج کر یوں صاف کر دیا کہ کشتی کے لیے لنگوٹ باندھنے کے رہے۔ اس کے بعد بدمعاشی پر اتر آیا۔ اور وہ زمانہ بھی ختم ہوا۔ آج کل ایک چھوٹی سی دکان کا لمبوترے کے سامنے سڑک کے کنارے بازار میں چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ کمر میں ملتانی لنگی، زیور کا دھڑ ولی ہو ننگا اور بہت ہوا تو ململ کا کرتا جس سے ظاہر ہوتا کہ کرتے کے دونوں بازو کندھوں پر سے گزر کر پیچھے لنگی پشت پر تنگ رہے ہوتے اور کرتے سے چوڑی سرخ و سفید چھاتی اور پھر تیل کرتا پیٹ ڈھیپ ہوتا۔ ڈھیپ کے ہونے پر کمر کنٹھے کی ایک ناکام کوشش ہوتی۔ ایک ہاتھ میں کھجور کا پنکھا۔ دوسرے میں حقہ۔ اور سامنے حقہ دھرا رہتا۔ کمرے کے اندر ایک لمبا بلاشی فرش کے متوازی چھت سے لٹکا ہوتا جس پر بٹیروں کے پنجرے لٹکے نظر آتے۔ بازار میں وہ کمرہ پہلوان نے کبھی شہد دکان کرنے کے لیے کرایہ پر لیا تھا۔ مگر اب اس میں کوئی سامان دکان میں رکھ کے بیچنے کو تو نہیں تھا۔ البتہ پہلوان کی ناکام منصوبے کی یادگار کے طور پر چند لنگ لوٹ کنستر اور کچھ ٹوٹے پھوٹے ڈبے وہاں پڑے تھے۔ ایک زمانے سے دکان کو خاطر سے پہلوان کی بیٹھک بن گئی۔ یہ کئی بنی جہاں جمع عشرے میں مہر ماروں کا مجمع لگا ہوتا۔ بٹیروں کی لڑائی کا گھڑا جمتا اور نئی نئی شرطیں بدی جاتیں۔ پہلوان اپنے آپ کو جنسی عوارض کا بھی ماہر سمجھتا تھا۔ جو شخص کشتی بنانے کی ترکیبیں اس سے حاصل کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلوان محض نسخے ہی نہیں بتاتا اس کے پاس تیار کشتے بھی ہوتے تھے۔ لیکن وہ انہیں اپنے استعمال کے لیے رکھتا تھا یا کسی پہ بہت مہربان ہو تو تحفتاً دے دیتا تھا۔ کشتوں ہی کے بل بوتے پر پہلوان نے کوئی سال بھر پہلے ایک نوجوان لڑکی سے بیاہ رچایا تھا۔ دن بھر پہلوان کے پاس بیٹھ بازوں، شاگردوں اور ساتھیوں اور مردانہ کمزوری کی دوا لینے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ لوگ اس سے بیٹھ حقہ پیتے گپ بازیاں کرتے اپنی غرض بیان کرتے اور پھر اپنی راہ لیتے۔ پہلوان کے پاس ہر وقت رونق لگی رہتی۔ پہلوان کی بڑی

بڑی پیچ دار مونچھیں تھیں۔ مگر داڑھی صاف تھی۔ استرے سے گھٹے ہوئے سر پر کبھی ہی چمک رہی ہوتی جیسے ورزش کر کے آیا ہو۔ کبھی کبھی مکھی کی چھوٹی سی سفید سفید ننگے سر کے درمیان ٹھہری رہتی۔ تاوقتیکہ وہ پنکھا جھل کر ہر طرف پھیر نہ دیتے۔ کانوں کی جگہ پر دونوں جانب دو آدھ انچ سے بالوں کے گچھے۔ جو مونچھوں سمیت وسمہ سے رنگے ہوتے۔ دھار سیاہ چمک رہی ہوتی۔ پہلوان وہیں سڑک کے کنارے بازار کے بیچ سب کے سامنے دن میں دو مرتبہ صبح کوئی دس گیارہ بجے اور شام کوئی پانچ بجے ایک بڑا پیالہ جس میں کوئی سیر سوا سیر چھانا جا سکتا، لبالب بھر گاڑھی سبز بھنگ کا نوش جاں فرماتے۔ جسے دو تین شاگرد دو گھنٹے کی محنت سے دکان کے اندر بیٹھ کر کونڈے میں بادام اور چار مغز ملا کر لکڑی کے ڈنڈے سے گھوٹتے اور ململ کی صافی میں چھان کر پہلوان کو پیش کرتے۔ اور پھر خود پیتے۔ حاضرین میں سے کوئی صاحب دل اگر دعوت قبول کرتا تو اسے بھی یہ مشروب نہایت ادب اور خندہ پیشانی سے حسب مطلب طرح دل کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ پہلوان نے محبت سے کبھی ستو یا کبھی ٹھنڈائی کے حساب سے سو زبان بھنگ شہر کیا۔ بلکہ پورے علاقے کا ایک طرح کا قومی مشروب تھا۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے مردوں کی اچھی خاصی تعداد اس سے شغل کرتی تھی۔ اور عرف عام میں یہ مشہور تھا کہ موسم گرما کی مضر اثرات کو زائل کرتی ہے اور اپنی ٹھنڈی تاثیر کی بدولت صحرا کو خارج کر کے طبیعت کو پرسکون اور مزاج کو معتدل رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عاشقی سردیوں میں بھی اسی طرح اور طبیعت کے گرمی پر ہونے کے بہانے اس شغل کو جاری رکھتے۔ تاہم اہل شہر کے اسیروں کو عام لوگ طربیہ اور استہزائیہ فقروں کا ہدف بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔ معاشرے کے ان ناصحوں کو جو بھی طنز سے مداح میں اہم معاشرے میں مدح کی زبان میں ان سے صرف نظر بلکہ محو کرنے کی کوشش میں۔ درحقیقت قبول کر لیا تھا۔ اور یوں ان پہلوانوں کو بغاوت کی شان اور ہیرو ہونے کی رومان سے بھی محروم کر دیا تھا۔ پہلوانوں کا اس شہر میں بھی بڑا دبدبہ اور رعب تھا۔ خاص کر ان لوگوں کو جن کی کشتیوں کی داستانیں ستاتی۔ جو کشتیوں کے مقابلوں، بٹیروں کی پالیوں، حسن و عشق کے قصوں، پولیس اور دشمنوں سے ہنگامہ آرائیوں اور دوستوں کی خاطر جانبازیوں کے قصوں پر محیط ہوتیں۔ سننے والے دم بخود حیرت زدہ بیٹھے سنا کرتے۔ پہلوان کے متعلق مشہور تھا کہ جس زمانے میں وہ دس نمبر میں تھا تو رات کو جب پولیس گشت پر آتی اور اس کے گھر کے باہر سپاہی حاضری لینے کے لیے بلند آواز میں پکارتا کہ "قادو خان ولد بختو خان حاضر ہو!" تو یہ اپنے صحن سے اس سے بھی بلند آواز میں جواب دیتا "ہاں اوئے ہاں، تیری ماں کا خصم حاضر ہے!" پولیس والے بیچارے ہنستے ہوئے کی لٹھیں بجاتے ہوئے چلے جاتے کہ سلامتی اسی میں تھی۔ ہم جب روز اسے ملنے اس کے گھر جاتے تو راستے میں پہلوان کی دکان پڑتی۔ وہ حسب معمول چارپائی پر محض تہبند باندھے بیٹھا ہوتا۔ ہم سلام کر کے گزرتے۔ وہ جواب دیتا "جی او بچو! جی آیاں نوں" "ٹھیک ہو؟" کیا میاں ہوئی۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلوان کی خلاف طرح حرکت کرے تو وہ گالی دیتا "کھوتا کہیں کا" اس شہر کی تہذیب کے مطابق اگر یوں ہاتھ گھور کے اور ہتھیلی کسی کے چہرے کی طرف کر کے کہا جائے تو مراد ہے کہ اس کے منہ پر جوتا مارا گیا ہے اور یہ بہت بری گالی اور انتہائی درجہ کی مضحکہ خیز

کو جاتی تھی۔ شہر کے کسی چند خاندانی روسا اور معززین کی سواری جب ادھر سے گزرتی تو پٹھان کھڑا ہو کر اس طرح سلام کرتا کہ داہنی کہنی کندھے کے برابر تک اٹھ آتی اور ہاتھ ادھے سر کے اوپر ہو کر سیدھا اور انگلیاں ماتھے کو چھو رہی ہوتیں۔ ہاتھ یوں لگتا جیسے دلہن کے ماتھے پر جھکا سہرا ہو۔ ہتھیلی کا رخ پہلے ماتھے اور سر کی طرف رہتا تاکہ "کھلی" کا شائبہ تک نہ گزرنے پائے۔ جب تک تانگہ یا بگھی گزر نہ جاتی پٹھان اسی طور میں سر اور کندھے جھکائے کھڑا رہتا۔ وہ رئیس بھی پٹھان کے پرانے رئیس ہوتے اور رئیس خاندان سے تعلق رکھنے کی نسبت سے نشست سے آگے بڑھ کر اور قدرے جھکتے ہوئے سلام کا جواب دیتا۔ پھر ہاتھ ماتھے سے سینے پر لا کر لمحہ بھر کو روک لیتا اور پھر وہ شخص معمول کے انداز میں نشست پر بیٹھ جاتا۔ تسلیم کے یہ انداز عربوں سے آئے ہیں اور دیہاتی بادیہ سے شہروں میں وسیع پیمانے پر منتقل ہوئے کیونکہ جہاں مختلف شہروں کی منفرد تہذیبی اقدار تشکیل ہوتیں وہیں اب اس شہر میں بھی پرانی اقدار تیزی سے سمٹتی جا رہی تھیں۔ "سائیں" جو تعظیم کا لفظ تھا اور کہلا جو [illegible] کے لیے استعمال ہوتا تھا [illegible] بے موقع اور بے محل [illegible] استعمال کر کے ان لفظوں کو صرف ایک کھیل بنا کر رکھ دیا۔ جہاں زندگی کا پورا کھیل ہی ہمہ وقت تغیر پذیر اور تبدیل ہوتا رہتا ہے وہاں تہذیبی اقدار اور قدیم اقدار کس کھیت کی مولی ہیں کہ یہیں مستحکم رہیں۔ شمع بیداری ہر رنگ میں سحر ہونے تک جلتے رہنے کی پابند ہے۔

فیرمنٹ اور طہ جیسے ایئرکنڈیشنڈ ڈبوں میں سفر کرنے والے لوگ تھے، مگر ہماری خاطر تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ [illegible] اس وطیرے کے بعد ہمارے دلوں میں ان کی قدر اور بڑھ گئی۔

گاڑی چھک چھک کرتی خوب تیز چلی جا رہی تھی۔ صحرا کی رات اپنی روایت کے مطابق ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ فراٹے بھرتی خوشگوار ہوا ڈبے میں ہر کسی کو بلاتخصیص سخاوت سے خنکی تقسیم کرتی پھر رہی تھی۔ دن کی گرمی کی مار کھاتے ہوئے بدن ڈھیلے پڑ کر پسرتے جا رہے تھے۔ ہم جہاں جہاں تھے، وہیں بیٹھے بلاتکلف اونگھ اونگھ کے گرنے اور سنبھلنے میں مشغول تھے۔ ہم سے ذرا ہٹ کر تیس پینتیس سال کی عمر کا ایک شخص سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی کھچڑی جیسی قلمیں [illegible] پگڑی میں سے نکل کر اس کے پروقار چہرے پر پھیلی اس کی مضبوط ٹھوڑی تک پہنچتی تھیں۔ اس کی چڑھی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے غصہ و نفرت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ [illegible] جو اولاً [illegible] سے مجبور تاہم حفاظت کی خاطر چوڑے سے ہٹ کے بیٹھا تھا۔ غنودگی سے جو ذرا سنبھلا تو اس نے دیکھا کہ وہی شخص چوڑے کے سامنے اس کا بازو پکڑے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی مونچھیں جنگلی جوہے کے کانٹوں کی طرح تنی ہوئی تھیں، اور سانس پھول رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، "مٹھا نوں ہوں سوہنا ایں۔ اللہ خوش رکھے [illegible] لگدا اے۔" چوڑے کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بازو اس سے چھڑا رہا تھا [illegible] کی کوشش کر رہا تھا نہ کسی کو بلا رہا تھا۔ بس خوف زدہ آنکھوں سے اس کا منہ تکے

جا رہا تھا۔ یوں بے ہوش [illegible] ہوش میں آتے ہوئے ڈانٹ کر پوچھا "کیسے ہو میاں؟" [illegible] فیرمنٹ جو جیسے حجر اور طہ بھی اٹھ کر [illegible] نے اس کا ہاتھ چوڑے کے بازو سے چھڑا کر جھٹکا۔ "اوئے بابو تو چھوڑ اس کو۔" وہ نہایت بے خوفی سے بیٹھا مسکرایا اور بولا "ذرا بھی نہ تھمو صاحب! یہاں ہر انسان کی حد [illegible] کچھ نہیں [illegible] اس کا ایک ساتھی مسافروں کی دھکا پیل پھلانگتا ہوا اور کچھ اپنے کھڑے ہو کر بیچ مسافروں کی درمیان سے اس کے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر مسافروں کے بیچ میں سے اس کی سیٹ کی طرف دھکیلا۔ چلتے چلتے کہنے لگا، "میں زنجیر کھینچتا ہوں۔"

فیرمنٹ نے کہا، "کوئی ضرورت نہیں، ان سے ہم خود نپٹ لیں گے۔" چوڑا اسی طرح فرش پہ بیٹھا بکی بکی خالی نظروں سے ہر کسی کا منہ دیکھ رہا تھا، اور ایک بات طوطے کی طرح نہایت عاجزی سے دہرائے جا رہا تھا۔ "آخر مسئلہ کیا ہے؟" [illegible] کہنے لگا، "میں آپ سب سے اس کی بے وقوفی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں فوجی ہوں اور چھٹی پر گھر جا رہا ہوں۔ یہ دیکھیے میرا سروس کارڈ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب وہ کوئی بھی [illegible] حرکت نہیں کرے گا۔ آپ اطمینان سے سفر کریں۔ میں ہر طرح کی ضمانت دیتا ہوں۔ آپ میرا یقین کریں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔ جھگڑے کو طول نہ دیں اور میری ضمانت پر اس کو یہیں ختم کر دیں۔ اسی میں آپ کا بھی مفاد ہے۔ جو کچھ ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں اور پھر معافی مانگتا ہوں۔" اس واقعے سے دوسرے مسافروں کے لیے تفریح کا ایک پرلطف موضوع مل گیا۔ ہر کوئی بات میں بات پیدا کرتے ہوئے پیش پیش تھا [illegible] حاضر دماغی کا ثبوت دے رہا تھا۔ خوب تیر تکے چست ہو رہے تھے۔ جن سے ہمارے دلوں کو بھی زخمی کر رہے تھے جیسے ریشمی کپڑے کو خاردار جھاڑی پہ ڈال کر کھینچا جا رہا ہو۔ مگر [illegible] یہ چوڑے کے ارد گرد بیٹھ گئے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس اس کی حفاظت کا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ان حالات میں جھگڑے کو بڑھانا نامناسب ہوتا۔ فوجی کا مشورہ درست تھا۔ اس کی ضمانت پر ہم بظاہر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے، لیکن ہم میں کسی طور پورا اعتماد اس پر بھی جم نہ سکا۔ ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ [illegible] کہا "اب تک تو سب کلاس میں سفر کرتے [illegible] خوف زدہ ہونے کا سبب آپ سب کی سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ [illegible] پتا چلتا ہے۔" کسی نے اس کو کوئی جواب نہ دیا۔ فوجی نے پوچھا،

"صاحب آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"ہمارا یہ تفریح کی ہے۔"

"آپ نے یہ خوب [illegible] جیسے لیے جی لیے۔ یہ تو سب خطرے کی [illegible] خاص طور پر جھنگ کی [illegible] عمریں اتنی کچی ہیں۔"

حجر بولا، "ہاں جی طرح کم کرنے کے لالچ میں کچھ بھول ہو ہی گئی۔"

فیرمنٹ نے کہا "ہم نے پہلی اس راستے میں سفر کیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

فرحی نے حیرت سے پوچھا "اکیلے؟"

"نہیں میرے ساتھ دو ملازم تھے، اور ہم فرسٹ کلاس میں تھے۔"

"تو یوں کہیں صاحب، کہ آپ نے قلعہ بند ہو کر سفر کیا تھا۔ اس پر نہ جائیں، وہ اور بات تھی۔ اجنبی کے لیے ادھر اکیلے سفر کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

گاڑی ایک اسٹیشن پہ رکی، جہاں ہمیں گاڑی کے ساتھ ایک بلند سفید پہاڑ لگا کھڑا تھا۔ [illegible]

[illegible] تو گارڈ سے بھی بات کر لی، اب آپ کا باقی سفر انشا اللہ ٹھیک گزرے گا۔"

شام کے چار بجے ہوں گے بس ہمیں اتار کر پھر پہاڑی چڑھائی چڑھنے لگی۔ سڑک کے [illegible]

[illegible] ایک تیر کا نشان تھا۔

فیرسٹ نے کہا، "چل ذاغ! [illegible] اور سامان کے لیے آدمی بھیج۔"

رات [illegible] خودغرضی کا ثبوت دیا تھا اس کی وجہ سے سب اس سے ناراض تھے اور

٦

س کا حصہ [illegible]

[illegible] برداشت ہو گیا، اور ہم بوکھلا اٹھے۔

فیرسٹ نے کہا، "باورچی ساتھ لانا چاہیے تھا۔"

خضر نے کہا، "ایک رات کی تو بات ہے۔ کل وہ بابو ملازم لے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے [illegible] ایک وقت کا کھانا پکانا ہے، وہ ہم خود پکا لیں گے۔" پھر سب خاموش ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ خضر بولا، "یہیں بت بنے کھڑے رہنا ہے یا سامان اٹھانے کے لیے بھی کوئی ہاتھ ہلائے گا؟" خضر [illegible] اور بعد میں بستر دبایا، اور چلتے ہوئے پوچھا، "کتنی بلندی ہو گی؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ دو سو فٹ۔" [illegible]

آخر سب کو سامان اٹھاتے اور اوپر پہنچتے ہی بنی۔

آخری سیڑھی پہ پاؤں رکھا تو سامنے کھلا میدان تھا جو تقریباً ایک سو [illegible]

تھا۔ درمیان میں ایک خیمہ [illegible]

Scanned with CamScanner

[illegible] اور کیبوس کے دونوں [illegible] طرف پر [illegible]
[illegible]
[illegible] طرف بے محابا پھیلتا چلا گیا تھا۔ جنگل کے اندر کہیں کہیں زرد، سفید اور بنفشی [illegible]
[illegible] تھا، اور جھیک کے چمکتے سورج کی صاف تیز روشنی میں گھاس کا ایک حصہ [illegible]
[illegible] تھا۔ زمین و آسمان کی ہر سمت [illegible] کا کھوج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

[illegible] طلب مراحل کی طویل فہرست ہوتی ہے جو ہم نے کیسی خشک اشیا کو کافی و شافی [illegible]

[illegible] لوٹا ہوا جا سکتا ہے کون لاتے گا وہاں سے [illegible] چتر نے شریر لہجے میں کہا کہ "گوشت، خنجر اور موم چاہئیں، یہ ہم میں سب سے زیادہ تکومند ہیں۔"

بوم نے کہا "ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ چتر ہمارے ساتھ چلے۔ ہرمن اور [illegible] نہ تھیں۔"

چتر نے پوچھا "وقت کیا ہے؟"

رخ نے گھڑی دیکھی اور کہا "گیارہ بجا ہے" ویسے تو فیزنٹ اور طرحیسے کی کلائیوں پر گھڑیاں بندھی تھیں، لیکن انہیں گھڑیاں دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

[illegible] میں تو شام ہو جائے گی اور پانی ہمیں کہیں سے مل جائے گا، یقیناً وہ دور نہ ہو گا۔

ویسے جس جس کو پیاس لگی ہے [illegible] چھ بجے کھڑے ہو گئے۔ چتر کہنے [illegible] "کوئی بات نہیں، بس ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ پھر صبح ہو گی تو [illegible] کہاں نہیں ملے گا۔"

دور مغرب میں، ہاہو کے گھر والی وادی کے پار جو پہاڑ تھے، ان پر بجلی چمکنے لگی، ہوا [illegible] حیران تھے کہ ہوا خوب تیز ہے، لیکن بالکل صاف اور مصفا کہیں مٹی کا ایک ذرہ نہیں، [illegible] میں ہوا اتنی تیز ہوتی تو ہر سمت اڑتی مٹی اور ریت کے ذرے ہر چیز کو اندھا [illegible] کے طلسم سے روشن چہرے پر [illegible] اور پھر اس نے بادل کی آنچل سے منہ چھپا لیا۔ [illegible] پھر دوسرا، پھر تیسرا، [illegible]

[illegible] چھماچھم ہم ایک ایک، دو دو میں بٹے، سر ہتھیلیوں پہ رکھے کٹ کٹ بجتے دانتوں [illegible]

[illegible] جیسے یک دم شروع ہوئی تھی، ویسے ہی فوراً بند ہو گئی۔ [illegible]

[illegible] اس کے ساتھ بیٹھا ہی کیوں تھا؟"

"میں کہاں اس کے ساتھ بیٹھا تھا، یہ خود میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔"

بوم، خنجر، طرحیسے اور چتر، چاروں فیزنٹ کے پیچھے یوں لائن بنا کے تیار کھڑے تھے کہ [illegible]

Scanned with CamScanner

[illegible]

"آج سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں۔"

"کچھ یاد آ رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیوں روٹھ جا رہے ہو؟"

"مجھے یہیں پڑا رہنا میری عادت بن گئی ہے۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible] ہوئے [illegible] وہ [illegible] کھڑے [illegible] دیکھ رہے تھے جیسے ہم [illegible] قسم [illegible] ہوں [illegible] اور جیبی مسافروں کو حیرت [illegible] سے دیکھنے [illegible] ہم نے چاہا کہ [illegible] ایک [illegible] جیسے [illegible] گھر [illegible] اور ایک [illegible] کو [illegible] شاید [illegible] کی طرح [illegible] ایک [illegible] اور [illegible] ایک تھوڑی میں [illegible] اور [illegible] ہماری طرف متوجہ ہو [illegible] مجھے دیکھو اور [illegible] ہم سب کے پاؤں [illegible] اور پھر [illegible] پکار "یہ جگہ [illegible] کی نہیں۔ خطرہ ہے چلتے چلو [illegible] تاکہ [illegible] کر [illegible] بنا دیں گے۔"

[illegible] جب [illegible] سڑک [illegible] ہوئی [illegible] جلدی [illegible] جلدی [illegible] جیسے وہاں بڑے بازار میں [illegible] منظر [illegible] ہے۔"

[illegible] ہم [illegible] اور پھر [illegible] جوک [illegible] میں [illegible] سڑک [illegible] اور [illegible] کی [illegible] پر مجبور۔ [illegible] دم میں [illegible] ہوا دیکھنے [illegible] کو [illegible] دیکھنے [illegible] سڑک [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] جو [illegible] اور [illegible] دھوپ [illegible] میں [illegible] ہر طرف [illegible] اور [illegible] میں [illegible] سے ہم گھر کی پناہ گاہوں سے نکل کر ابھی پہلے پہل متعارف ہوئے تھے ہمارے [illegible] کھانے [illegible] ہاتھوں سے [illegible] کی کوشش [illegible] وجود کا [illegible] شروع کر دیا۔

ہم نے [illegible] کی خاطر صبح [illegible] میں [illegible] کر [illegible] اور شام کو [illegible] میں [illegible] مگر [illegible] سے [illegible] ہم [illegible] دوست [illegible]

تھے اور [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] کوئی [illegible] دیا کہ [illegible] کرنا چاہیے۔ غریب اور [illegible] ہم [illegible] کے [illegible] کم [illegible] کے دوران [illegible] پر [illegible] رکھنے کے لیے [illegible] میں صرف [illegible] روپے [illegible] کر چلنے کی [illegible] نہیں لیکن یہ تو شروع میں ہی [illegible] کہ [illegible] اور [illegible] کی پابندی [illegible] وسیع [illegible] کی بدولت [illegible] کر سکتے تھے جبکہ دوسرے [illegible] کہ ایک پیسہ بھی [illegible] کر سکتی۔ اب کھانے کی بات [illegible] پر [illegible] کو [illegible] سکتا تھا جو [illegible] کا [illegible] کریں۔ لیکن ایسا شاید ممکن نہ تھا۔ [illegible] میں سے ہر کوئی [illegible] لیکن [illegible] صرف ایک وقت کا کھانے کا [illegible] تھا۔ [illegible] پروگرام تھا۔ باقی [illegible] ایک وقت کھانے کے بھی پیسے دینے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی [illegible] کہ [illegible] میں سے کوئی ایک وقت کے کھانے کی دعوت بھی بھلا کیوں [illegible] سب [illegible] خاموش بیٹھے تھے [illegible] اور [illegible] کرنے میں محو تھے۔ پھر [illegible] اور [illegible] کو [illegible] چلیں"

"ہاں، چلو۔"

[illegible] نے کہا، "بھئی اسی دور سے رونق دیکھتے [illegible] اب [illegible] اور [illegible] رونق ہی [illegible] کے دیکھیں۔"

وہی سانولی لڑکی، سیاہ بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجائے، سہیلی کو ساتھ لیے، ایک دکان سے نکل کر دوسری میں داخل ہوئی۔ [illegible] چہرہ [illegible] رہا تھا جیسے شفق پر [illegible] چھائے ہوئے ہوں۔ ہم بھی [illegible] دکان میں جا گھسے۔ اس نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا کہ کہیں عشاق [illegible] نہ ہوں۔ وہ [illegible] دیکھنے لگیں اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ [illegible] ہوئے باہر نکل گئے۔ پھر [illegible] بھی چلا [illegible] کے کان میں [illegible] کچھ کہہ رہا تھا [illegible] کی [illegible] سے [illegible] لڑکیاں [illegible] پھر [illegible] منتخب کرنے لگی۔ [illegible] کی ترغیب پر [illegible] اور [illegible] کی لنگیا خریدی۔ [illegible] خریدی [illegible] شاید [illegible] رکھنے کے لیے [illegible] خریدی اور [illegible] ساتھ شامل ہو گیا۔ [illegible] کے پیچھے [illegible] اور [illegible] پیچھے [illegible] رہے تھے۔ [illegible] لڑکیوں [illegible] اور [illegible] کے [illegible] لڑکیوں کی [illegible] اور [illegible] جو ان کی [illegible] کر رہی تھیں [illegible] مگر [illegible] ان کے [illegible] پیچھے چلے جا رہے تھے۔ ان کی [illegible] کا [illegible] دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر پیچھے پیچھے [illegible] جا رہے تھے۔ سڑک کی ڈھلوان ختم ہوئی [illegible] اور [illegible] پھر مڑ کر دیکھا۔ پھر [illegible] اور مجھے [illegible] کو یہ کہہ کر ان کے پیچھے [illegible] سے روک دیا۔ "کیوں؟ [illegible] کھانے کا ارادہ ہے کیا؟"

Scanned with CamScanner

سے حافظے سے خارج ہونے لگے اور منظر ہجوم سینہ کی بدر قہیں لگے۔ چند ہی جملوں میں
رہ گیا جس میں چند یاد چھوٹے وقفے ایک دوسرے پر وزن کسے ہوئے دھوپ چھپ کرنے لگے
یہ تلاش یہی شام کو پہنچا ہوں یہ کہ سب کو کیا جانے ہم پاؤں گھسیٹتے واپس بازار کی طرح
ہم سب دیکھ پھر ہوٹل بازار میں اتر رہے تھے۔ میں نے بائیں طرف بیچ گلیاں نکلتی تھیں
جن میں سکھ کباب اور روسی سالن بیچنے والوں کی دکانیں تھیں۔ وہ لوگ جنھوں نے ایسے
کھانے کھانے میں مہارت کو پہچان کر سے شوق سے لیا تھا مزے سے ان گلیوں میں اتر کر بے تکلفی سے
پیٹ بھرنے کی روش کو رہے تھے۔ مگر صرف یوم چورے جیجر اور چھ میں چار آدمی ایسی میں
ہونے پر ملا تو ہر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر کسی گندی بدبودار گلی کے کنارے بیٹھ کر
کباب اڑا رہے ہوتے، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ وہ فرشتہ خو ہم سے اور زاغ جیسے خاندانی اشراف
کے ساتھ پھنس گئے تھے جو کہ مہاجر وقار یوں کی بینی پر فخشا کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں
ملامت ہو کر وہ چاٹا اس پر بھی اضافہ نہ تھی، اور سادہ آدمیوں کے کھانے کا بل کسی اچھے
ریستوران میں اکیلے ذکیلے میں کر لینے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ تینوں چندہ کر کے ساتوں کا بل یقینی
بڑی حد تو سکتے تھے لیکن باقی چاروں کی عزت یہ بات کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ نتیجتاً سبھی
ایسی ایسی تشدادات کے گرداب میں پھنسے، ابھی تک بھوک کا بار صبر سے برداشت کرتے ۱ رہے تھے۔
دوپہر اپنے عروج پر تھی۔ بازار کی رونق شاید ماند ہو رہی تھی۔ ریستورانوں میں ابھی رش چل رہا
تھا۔ ہم سڑک سے ٹھہرے دیکھ رہے تھے۔ چھجوں اور کمروں میں خوش پوشاک لوگ بیٹھے
ہوئے ہاتھوں سے کھانا سمیٹ سمیٹ کر اپنی اندر ٹھونستے رہے تھے۔ ہم منہ بدوں کی طرح انھیں
دیکھتے رہے۔ پھر یہی سوچ کر جیبوں پر خود ہی شرمندہ ہوتے ہوئے ہیں ایک جگہ پر جا ٹھہرے ہوئے
جہاں سڑک کی ایک طرف دکانیں تھیں، اور دوسری طرف کمر تک بلند پرچھائیں کی ہوتی ہوئی
پانیوں کی رینگ لگی تھی، تاکہ کوئی راہ گیر نیچے نہ گر جائے۔ کوئی چالیس فٹ نیچے سمیٹا تھا
جس میں دو ہوٹلوں میں ایک بار کر کے ان میں ہر دو سرے کی شروع ہوتے تھے۔ منظر میں
جمع تھے جیسے ہم سیاحوں کے سامنے ان کی طرح دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مجمع جیسے
کہ باہر کی طرح بکوڑے لیتا، مچل رہا تھا۔ لوگوں کی ایسی میں باتیں کرنے کی ایک گیتایانی بلند
ہورہی تھی، اس گرمی میں سے اٹھتی، ہماری کانوں میں کراہت پیدا کرتی، ایسے مسلسل اٹھتی
رہی تھی جیسے ایک چاے کی بڑی کڑاہی میں سے بھاپ کے بل کھاتے بادل اٹھ رہے ہوں۔ انسانوں
کی اتنی بڑی مجمع کا اپنا ایک کردار ہوتا ہے، جو جنگل سے نکل نکل کر آتے ہوئے وحشی
جانور سے بہت کچھ مشابہ ہوتا ہے۔ گھومتے ہوئے ان کے رد عمل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی
ممکن نہیں ہوتا کیا خبر وہ ذرا سی بات پر بدک کر بھاگ اٹھے، یا بھڑک کر حملہ آور ہو جائے۔ وہ
خود بے چین کرنے اور سب سے زیادہ خوف زدگی کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اور دیکھنے والوں کو
شور میں گھسی اور سکر کی علاوہ بلند عجیب مبہم سے خوف اور ہوس کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ
سب وارداتیں ہم پر گزر رہی تھیں۔ لیکن اس لاحاصلی میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ہم چاہنے کے
باوجود وہاں سے ہٹ نہیں رہے تھے۔ شاید ہم اور وہاں پر سڑک سمٹ کئی نیچے صرف ایک سمت
رہے تھے۔ شور ٹھیک کر نکلتے وانی، ایک مسلسل رو نالی کی طرح ہجوم میں رواں، آہستہ آہستہ

پر چل پڑے۔
ہمارے قدم نادانستہ ریستوران کے سامنے ۱ کر رک گئے۔ رش چھٹ چکا تھا۔ بیشتر میزیں
خالی پڑی تھیں۔ سڑک پر اب مختلف کھانوں کی خوشبو آ رہی تھی، بھنے ہوئے جھوٹی بوٹیوں سے
لتھڑی والی ماسی کھانے کی بو میں رچی تھی۔ بھوک بھی لگ لگ کر ماند پڑ چکی تھی۔ لیکن بیزاری
اور چبھتی ہوئی ندامت آمیز تھکن اندر اعضا پر جمتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
جیجر بولا: "یار بڑے زور کا پیشاب لگا ہے۔ کیا کروں؟"
یوم نے کہا:

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

"اوئے یار میں پیشاب سے مر رہا ہوں اور تو مجھے شعر سنا رہا ہے"
یوم ہنسا۔ چورے کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ قریب ہی کہا، جس جس کو
پیشاب آیا ہے وہ ریستوران میں جا کر ضرورت پوری کر لے لیکن باری باری۔ سب اکٹھے ہلا نہ
بول دینا۔" ایسا ہی کیا گیا۔ آخر میں قریشی گیا۔ لیکن وہ جو گیا تو اس نے واپس آنے کا نام ہی نہ
لیا۔ آخر تھک کر چورے سے کہا گیا کہ وہ اندر دیکھ کر آئے۔ اس نے آ کر بتایا کہ وہ ایک بڑی بڑی
مونچھوں والے موٹے سے آدمی کے ساتھ میز پر بیٹھا چائے پی رہا ہے اور پیشتر ازیں ہمارے
بھوک بیٹوں سے ایک ہوک اٹھی جو معدوں تک پہنچی۔ قریشی اتنی میں وہ اندر سے نکل کر اس
بارہ پیسہ لے کر باہر نکلا اور بتایا کہ "وہ شخص میرا رشتہ دار ہے اور پورے مہینے کے لیے ایک
بنگلہ کرایہ پر لے کر یہاں قیام پذیر ہے۔ وہ مصر ہے کہ میں رات اس کے پاس ٹھہروں۔ اس نے چند
دوستوں کی موجودگی کے بے محری کا سخت گلہ ہے۔ منیدہ اور جمیلہ بیچ چکی تھیں۔ دھیرے سے
خاموش ہو گئی۔ تمہیں پتا ہے نا کہ جمیلہ کی بات بھی بس بے خوابی تھی۔ میں کل صبح وہاں
کیمپ میں واپس پہنچ جاؤں گا۔ تم لوگ بھی یہ ماحول اور بڑا شام کی روشنی دیکھ کر واپس
لوٹنا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے واپس اندر چلا گیا۔ ہم سب ہکا بکا کھڑے اس کے دو دو پیسے
ہاتھوں میں لے کر وہیں کھانا شروع کر دیا۔ اس سے پیٹ تو کیا بھرنا، لیکن وہ چند لقمے ہو ہی
گئے۔ تھکن اور بیزاری اس میں نہ کسی میز کے بیٹھنے کی بیزاری پر ماری ہوئی ہمت نہ ہو
اور اگر کسی میں کچھ تھی تو اس کی کمر اور بیٹھے بیٹھے اندر سے کی موڑ کے رکھ دیے رہ کے
منہ سے نہیں ایک مرتبہ گنیت کا نعرہ نکلا پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ بار بار سامنے ہی وہ
سوال پھر سامنے تھا کہ کہاں جائیں اور کیا کریں، واپس کیمپ چلے جائیں؟ اس خیال سے ہی
تھکن اور شدید شکست کا احساس سے گھیر لیا تھا۔ یہ پررونق قصبہ یہ گاندش جادو اور اور یہ سڑک
جو ہم کو پورا پورا گرمی کی موسم میں عون عافیت میں سنبھالے رکھتی ہے۔ ہمیں چند گھنٹے
میں سہارا سکتا اور باہر دھکیل دینے پر تلا بیٹھا ہے ہمیں ضد ہے کہ واپس نہیں جائیں گے اور
اس کی حسین شام کو حسن کی اتنی شہرت ہے ہم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر رہیں گے۔ قریشہ ہوا نہ
صبح جہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر پہنچے تھے۔ وہاں درختوں تلے گھاس کے میدان میں چل
کر بیٹھ گئے۔ شام ہوگی تو پھر یہاں آ جائیں گے۔ منظر عام حسینوں کے چہرے دیکھنے چلنا

Scanned with CamScanner

مسلسل طرح طرح سے چیک اور مسہ ان کی کمر سے لگتے ہوئے جا رہے تھے۔ جمّو، جوزہ اور مریم برابر برابر چل رہے تھے اور کبھی ان کے ساتھ آ ملتے، کبھی سڑک کی دوسرے کنارے چلنے لگتے۔ چتر اور طرح طرح کسی کو قریب پھٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ ہم سب کی دن بھر کی اس خوش نصیبی پر حسد سے سلگ لیے تھے۔ دھر دھر حسن کی طاقت ان میں بھکی، بھوک اور بیزاری نے باقی نہ چھوڑی تھی

ہم سب نے سعیدہ اور جمیلہ کو اسی سال محرم کی سات تاریخ شام میں جھولے کے جلوس میں دیکھا تھا۔ شہر کے ایک دور رہنے کے باہر جلوس ڈھلوان پہ کھلی جگہ میں کھڑا تھا۔ ان بڑی ٹانگوں کا اڈا وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ لوگ بلند دکانوں کی تختوں اور چھتوں پر چوباروں کی کھڑکیوں میں سٹے پر رہے تھے۔ یہی حویلی کی کوٹھی میں چالیس لڑکیاں بڑا سا دائرہ باندھے کھڑی درد بھری سریلی آوازوں میں مرثیہ خوانی کر رہی تھیں۔ بیت کا مصرعہ اٹھا ہو وہ ان کی بے بازو ہوا میں بلند کر کے ہاتھ زور سے چھاتی پر مار کو ماتم کرتیں۔ سیاہ لباس میں ان کے سنہرے بدن ایسی ڈالک مارے تھے کہ ہم بت بن کر رہ گئے۔ ان کے پیچھے ادھیڑ عمر کی ان کی مائیں اور عورتیں مرثیہ خوانی میں اور ملک ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ان کے پیچھے مسمت مند ہوکے مرکے ڈالے کرے ہوئے نہایت مستعد چوکس ہو کھڑے تھے اور کیا مجال کوئی شخص ان کا حلقہ توڑ کر آگے بڑھ سکے۔ کوئی شرارتی چھوکرا چاہے جب ذرا سی دکھاتا تو ایسی مرمت کرتے کہ وہ بھاگتے ہی بنتی۔ ان لڑکیوں کے چہرے ایسے تھے کہ جس پر بھی نگاہ پڑتی وہیں جم کر رہ جاتی۔ گردن اور چھاتی کے بیچ کھلے سیاہ گریبانوں کے درمیان ماتم سے سرخ ہوئی چھاتی کا کھلا گلاب ایسے تو بہت دلکش لگتا لیکن جب بے دردی سے ماتم کرتی ہوئے پھر وہیں ہاتھ کی چوٹ پڑتی تو ترس آتا، اور اپنے دل پر چوٹ پڑتی محسوس ہوتی۔ جی چاہتا کہ کاش یہ اب زور ماتم نہ کریں۔ جمیلہ کے بیچ اور خوب سرخ ہوئے بال بکھرے تھے۔ ان کے سنہرے چہرے پر بالکل بالوں کی ہی سی رنگت کی بہت ہی سرخ سرخ تل لٹھے ہوتا سا قد اور وہی بھوری شربتی سی آنکھیں۔ اس کے برابر سعیدہ کھڑی تھی، سیاہ بال، سیاہ مست آنکھیں، دراز قد اور صاف لپٹتا ہوا گندمی رنگ۔ مریم اور چتر جو شے سے مہاجر ہو کر آئے تھے ایک شہادی بے حیاء کے عالم میں پوچھ رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں جن کا جلوس ہے۔ بتایا گیا کہ کنجریوں کا جلوس ہے۔ حیرت و استعجاب سے انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا یہ نور معصوم صورت حسن کی شہزادیاں جو سب کی نگاہوں کا مرکز ہیں یہ بھی کنجریاں ہیں؟ انہیں مطلع کیا گیا کہ یہ تو سب ہی کنجریاں ہیں۔ ابد ہمیں حیرت مریم اور چتر کو ان کے نام کے ساتھ ذہن میں بھی کنجری کا لفظ جاگزیں کرنے تکلیف ہوتی۔ مریم اور چتر نے پوچھا "آپ سب ان کو اتنے ممتاز طور پر کیسے کر جانتے ہیں؟"

"ارے واہ انہیں کون شہر میں نہیں جانتا۔ بچہ بچہ ان کے نام اور صورت سے واقف ہے۔ اسی خوبصورت اور اتنا اچھا گانے اور ناچنے والیاں ہیں۔ لوگ کیسے نہیں جانیں گے اور پھر گانا سننے میں بھلا کوئی عیب ہے؟ شہر کا ہر بڑا آدمی کسی نہ کسی طوائف کو داشتہ رکھتا ہے۔ ورنہ وہ بڑا آدمی کا ہے؟ اس علاقے کا کوئی زمیندار ہی ایسا ہے کہ چکلے میں اپنا ڈیرہ نہیں ہے۔ وہ جب شہر

تا ہے تو اپنے ڈیرے پر کسی نہ کسی گانے والی کو بلا کر اپنے دوستوں اور مصاحبوں سمیت گانا سنتا ہے۔ جب تک شہر میں ٹھہرتا ہے ہر شام یہی محفل برپا ہوتی ہے۔ شراب کا دور چلتا ہے۔ روپیہ ختم ہوتا ہے تو ڈیرہ چوکیدار کے سپرد کر کے مزید روپیہ کا انتظام کرنے اپنی زمینداری کو لوٹ جاتا ہے اور چوکیدار بھنگ گھوٹنے میں لگ جاتا ہے۔ غریب غربا کم ہاں شادیوں پر ناچ گانا نہ ہو تو نہ ہو، باقی تو سب شادی پر ناچ گانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس جلوس میں ایک لمبی سانولی سی عورت تھی جو پہلے مرثیے کا بول اٹھاتی اور پھر سعیدہ اور جمیلہ ایک ایک مصرعہ اٹھاتیں۔ اس کا نام بدرو بتایا گیا۔ کچھ عرصے بعد جو عرصے کے کسی چچیرے یا ہیر یا مسیر کی شادی تھی۔ وہ ہمیں اپنے گاؤں لے گیا۔ دوپہر کو ہم نے قورمہ اور تندور کی روٹیاں کھائیں۔ پھر ایک بہت بڑے پھیلاؤ والے برگد کے نیچے دوب کی سبز بندی ہوئی چارپائیوں پر طرح باندھے حقہ چوستے کوئی سو کے قریب آدمی بیٹھے تھے جن میں سے ہر ایک نے سہرا بندی پر سو سو اور دو دو سو روپے سلامی دی۔ سامنے میراثی کھڑا ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر بانگ دینے کے انداز میں سلامی دینے والے کا نام اور رقم پکارتا۔ چارپائیوں کے آگے کچھ صفیں بچھی تھیں۔ ان پر اور ادھر ادھر خالی زمین پر مزارعے کمی اور غریب لوگ بچے بالے اپنی میلی غلیظ چیتھڑوں میں ننگے بیٹھے زرداروں کے اس اظہار زر کے کھیل کو خاموش دلچسپی اور ایک گونہ لاتعلقی سے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ یہ ہو چکا تو بدرو مع اپنے سازندوں کے بلائی گئی۔ اس طائفے کو جگہ دینے کے لیے صفوں میں بیٹھے لوگ اٹھ کر پیچھے دھکیل دیے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر چلچلاتی دھوپ میں مجبوراً جا کھڑے ہوئے۔ چونکہ بدرو کے مجرا کرنے کی شہرت ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی پہلے سے ہو چکی تھی اس لیے دیکھتے دیکھتے ہزاروں کا مجمع اس سر دھوپ اور حبس میں بدرو کو سننے کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ اس نے پہلے سہرا گایا۔ چارپائیوں پہ بیٹھے مہمان زمیندار اس کے مقابلے میں اور دوسرے اور اس کے خاندان والوں سے اپنے اپنے تعلق کو دوسروں سے زیادہ گہرا اور مضبوط ثابت کرنے کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ویلیں دیں۔ عام لوگ دوسرے کی ویلوں کے مظاہرے کو بھی اسی سلامی والی لاتعلقی اور خاموشی سے دیکھتے رہے۔ سہرا ختم ہوا تو ہر طرف سے فرمائشیں بلند ہوئیں "کافی گاؤ"۔ اس نے آواز اٹھائی

> کنجری بنیاں میری عزت نہ گھٹدی
> میکو نچ کے یار منانون دے

آواز ایسی بلند کھلی اور نکھری ہوئی کہ دور دور تک ہر کان میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک سر پہنچے۔ لاؤڈ اسپیکر کس بلا کا نام ہوتا ہے۔ وہ واز پکار پکار کے اعلان کر رہی تھی کہ لاؤڈ اسپیکر کا سہارا تو وہ لیتے ہیں جنہیں راگ ودیا پر پوری دسترس نہ ہو یا جنہیں آواز کا عیب چھپانا مقصود ہو۔ جوں جوں وہ گاتی اس کی سر لہریں ایک ساعت و سامعہ مجمع کو حلق سے اگلتی اور بلند ہوتی جو بیک وقت طمانیت تشکر، سادگی اور حصول لطف کا مظہر تھے۔ اور بدرو اور اس کے فن کی داد تھی، مفلوک الحال، ننگے بھوکے دھول مٹی سے اٹے لوگ جو دھوپ اور حبس میں کھڑے ہو رہے تھے اور بظاہر جذ اور گنوار نظر آتے تھے شعر اور سر کیا لیے اتنا ذوق لطیف رکھتے تھے۔ ہمارے لیے یہ بات نہایت تعجب کا باعث بن رہی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

[illegible] پر نوید کی کہانی کا [illegible] ذہن گیا لیکن مجمع ویسے ہی سکتہ زدہ تھا۔ [illegible] دور تک کچھ نوجوان کی جھیلوں پر [illegible] سے بھی زیادہ معلوم ہوا۔ مضمون سرخ میں [illegible] دو [illegible] مردوں کی مجموعہ دنیا میں سے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] ایک پیچ جاتی۔ [illegible] سے [illegible] تھی۔ صوت و آہنگ کی اس جہالت پہ کسی رد عمل کی [illegible] مردوں کی [illegible] صحبت سے [illegible] مجمع میں [illegible] رہی تھی۔ [illegible] کو وہ [illegible] دیکھ رہی تھیں کہ عجیب بات ہے کہ اپنے [illegible] جب وہ سارے بندھن توڑ کر آزادی کا نعرہ لگاتی ہو [illegible] کی [illegible] مسحور ہو کر [illegible] ہو [illegible] کی [illegible] سمجھ میں [illegible] بدل [illegible] سے بچے [illegible] میں آکر گڑبڑ ہو جاتی۔ شہر میں دستور ذرا مختلف تھا۔ بارات آدھی رات کے قریب لڑکی والوں کے گھر [illegible] نکاح کے بعد [illegible] ہو [illegible] والے شکر کے شربت سے [illegible] کھانے [illegible] کھلائے [illegible] دوسرے دن ولیمے کا کھانا [illegible] کے گھر [illegible] بھیجتے ہیں۔ [illegible] میں [illegible] دولہا [illegible] ایک مجرے کی محفلیں جمتی تاکہ آزادی میں فرق نہ آئے اور واقعی خوب گُھل کھیلتے۔

کچھ دیر [illegible] گروہوں میں [illegible] پیچھے [illegible] کی طرف [illegible] پھر اکٹھے ہو کر چلنے لگے۔

[illegible] نے کہا [illegible] عجیب [illegible] کوشش نے کمال کر دیا ہے۔ حالات کے ستائے ہوئے دو [illegible] ایک دوسرے سے [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈالے [illegible] دشمن [illegible] سے [illegible] ہو جاتے ہیں۔"

[illegible] اپنے قدموں پر رک گیا۔ چتر اور بوم بھی ٹھہر گئے۔ جورے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ [illegible] آنکھیں [illegible] دیکھ رہی تھیں [illegible] جیسے [illegible] چہرے پر [illegible] آنکھوں میں [illegible] کی [illegible] خوف کی سیاہ پرچھائیاں چھائیں۔ چتر اور بوم نے حیرت سے [illegible] کہ اسے کیا ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں [illegible] سے [illegible] بھی [illegible] وہ [illegible] بوم [illegible] بے کل ہو کر پوچھا "جورے تم ٹھیک تو ہو؟ بات کیا ہے؟"

وہ ٹھہرے تو دوسرے بھی چند قدم آگے بڑھ گئے تھے واپس پلٹ آئے۔

[illegible] اور اعتماد سے کہا۔ "مجھے بھی ایسی ہی حسین موت چاہیے۔ دوست دشمن کی

سامنے، محبوب کی آغوش میں؟"

[illegible] بولا "آپ تو خود زمانے بھر کی محبوب ہیں [illegible] آپ کو بھی محبوب کی تلاش ہے؟"

بوم نے تیز ہوتے ہوئے کہا "بکواس مت کرو۔" جورے نے بوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا "کیوں بلاوجہ جھگڑتے ہو، کہنے دو جو کہتا ہے۔"

[illegible] نے جورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اچھا سچ کہو [illegible] شریں میں اس علاقے کے لوگ بڑے صاحب ذوق ہیں۔ مصری کی ڈلی کی طرح تھوبہ اٹھا کر منہ میں [illegible] کا [illegible] تو ان کی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

[illegible] نے کہا "تو خود اس وقت چوروں کی طرح الگ [illegible] کس کے [illegible] کہا ہو اور کیسے ہو [illegible] اس طرح کی کوئی بات کی تو سمجھو لو بہت پچھتاؤ گی۔"

چتر نے کہا: "دیکھو بھئی اگر [illegible] چلا گیا ہو تو یہ مطلب نہیں کہ ہم پردیس میں ایک دوسرے کے سر پھوڑیں۔ ٹھہرا [illegible] کو الگ لے جاؤ۔" [illegible] بازو سے پکڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔ چتر صاحبوں میں کشیدگی کم کرنے کے لیے کہنے لگا "میرے پاس کچھ [illegible] ہوئی ہو [illegible] میں یہ علم تم سب کو دکھاؤں [illegible] کوئی بات نہیں وہیں چل کے سہی۔"

بوم بولا "چھوڑ یار تو نے [illegible] جرش میں [illegible] کرنے ہی تھا ساتھ میں [illegible] بھی [illegible] جورے اور میں تو سگریٹ سے بھی تنگ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

چتر نے کہا "کوئی بات ہی نہیں [illegible] سب ٹھیک ہو جاتی گا۔" پھر [illegible] سے پُر اعتماد لہجے میں کہا "نکال یار پیکٹ [illegible] ایک ایک پلا دیں کیا یاد کریں گے۔" [illegible] نے جیب سے پیکٹ نکال کر پہلے کھول کر دیکھا اس میں چار سگریٹ بچے ہوئے تھے وہ اس نے بوم کے حوالے کر دیا۔ اور [illegible] ایک سگریٹ بوم اور جورے کو پیش کیا اور یہ کہتے ہوئے دو جیب میں رکھ لیے۔ "پھر کام آئیں گے۔"

چتر نے [illegible] سے پوچھا "یار یہ فہرست میں جو بتایا تھا کہ اس کے دوست نے جمیلہ کی نتھ کھولی تھی، اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"تو نہیں جانتا؟"

"نہیں۔"

بوم نے کہا "مجھے بھی علم نہیں کہ یہ نتھ کھولنا کیا ہوتا ہے۔"

"خیر! میری بدعلمی تو سمجھ میں آتی ہے [illegible] کو بوم ٹھہرا، لیکن حیرت ہے کہ چتر بھی نہیں جانتا۔ ویسے تو کیا حق ہے کہ یہ رسم ہندوستان کے ہر چکلے میں رائج ہے لیکن ہمارے شہر میں اس کا کچھ زیادہ ہی چرچا رہتا ہے، اور تم دونوں یہاں نوواردہ ہو۔"

[illegible] اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باقی سب اس کے قریب حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ وہ کہنے لگا "تو سنو! کنجروں کے ہاں قاعدہ ہے کہ نئی کنواری لڑکیوں کی ناک میں کنوار پنے کے اعلان کے طور پر سونے کی [illegible] گول کر کے ڈالی ہوئی ہے [illegible] کہلاتی ہے [illegible] کی [illegible] تیرہ چودہ

عروس کی ہو جاتی ہے جو اس کے بعد بھاری بھرکم پیسوں کے عوض اس کی نتھ کھولائی کی تاریخ کا اعلان کرتی ہیں اور اسے خوب مشہور کرتی ہیں۔ اس پر بڑے بڑے زمیندار، سیٹھ، [illegible] کے صاحب حیثیت عیاش و عشاق اس تاریخ کو ان کے گھر پر جمع ہوتے ہیں اور لڑکی کی بولی شروع ہوتی ہے وہ کنواری زندگی میں پہلی مرتبہ [illegible] سے زیادہ بولی دینے والے مرد کی شب بنتی ہے۔ پہلی رات اس کے ساتھ گزارتی ہے اور نتھ کھل جاتی ہے تقریباً ہفتہ بھر یا کچھ ایسی ہی مدت کے لیے وہ دلہن بن اس کے ساتھ اپنے گھر میں رہتی ہے یوں سمجھ لو کہ یہ کنجروں کی ایک طرح کی شادی ہے۔ خوب جشن منایا جاتا ہے دیگیں پکتی ہیں کنجر برادری میں کھانا بٹتا ہے، لیکن نکاح نہیں پڑھایا جاتا۔ اور نہ ہی وہ عمر بھر کے لیے اس کی پابند ہوتی ہے ان چند راتوں کے بعد نتھ کھولنے والے کا کھیل ختم اور پیسہ ہضم ہو جاتا ہے اور وہ رنڈی بن جاتی ہے جس سے جس قیمت پر جب چاہے تعلق کرے [illegible] ہے جبکہ ایک وضع دار لڑکی [illegible] کے بھی عمر بھر [illegible] ہے کہ نتھ کھولنے والا جب بھی قیمت دے کر اسے بلانا چاہے تو اس کا حق ہے [illegible] میں فائق گردانتے ہوئے انکار نہیں کرتی۔ غیرت کم دوست کی کہنے پر جمیلہ جو اتنی دور سے ہمیں کو بھی ساتھ لے کر آ گئی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے۔"

چتر نے پوچھا، "گزشتہ کی دوست نے جمیلہ کی کیا بولی لگائی ہو گی؟"

طرحیسی نے بتایا، "یہی کوئی دس پندرہ ہزار روپیہ"

چتر اور بوم حیرانی سے بولے "دس پندرہ ہزار روپیہ!"

"اور نہیں تو کیا؟ جمیلہ کی نتھ کھولنی کوئی معمولی بات ہے؟"

بوم نے کہا، "بڑا روپیہ ضائع کیا۔"

"عمر یہ تو اپنی اپنی گرہ اور طلب کی بات ہے۔"

چتر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "جب کبھی میرے پاس دس پندرہ ہزار روپیہ ہوا تو میں جمیلہ کی دوبارہ نتھ کھولوں گا اور اتنی ہی قیمت دے کر۔"

اس بڑے [illegible] کی ایک وجہ سانولی لڑکی کو دوبارہ جھلک سے دیکھنا بھی تھا اس کی کھڑکی کو انھوں نے سوتے جاگتے برابر نگاہ میں رکھا لیکن اس نے ایک بار بھی جھانک کر نہ دیکھا۔ بہت مایوس ہوئے۔ لیکن کیا زور تھا۔ [illegible] وہاں ایک دم [illegible] جیسے گھڑی شام ہو گئی ہو [illegible] سے گھاس پھونس [illegible] کوٹ سنبھالے اور چل پڑے۔ چتر نے کہا "کدھر؟" [illegible] دکانوں [illegible] اندھیرا زیادہ گہرا لگ رہا ہے [illegible] روشنی [illegible] اور بھیانک کی طرح کی بجائے [illegible] طور پر پھیلا کرتی ہیں۔ بڑا بازار بلندی پر ہے دیکھتا وہاں روشنی ہو گئی۔ [illegible] سبزیاں، چیزیں [illegible] وہاں [illegible] کچھ جلا تھا اگرچہ دکانوں کی اندر بلب روشن ہو چکے تھے۔ چتر نے کہا، "اپنا لڑکا [illegible] وہ طرحیسی ذرا ایک دوست سے ملنے جا رہے ہیں۔ تم بازار کی سیر کرو۔ ہمیں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔" چتر نے اب کہا اور وہ دونوں چلے اور نئے رخ پر چل دیے۔ چتر جو دو گھنٹوں سے طرحیسی کے کانوں میں پھونکیں مار رہا تھا اس کا کوئی نتیجہ تو برآمد ہونا

تھا رونق اپنے عروج پر تھی۔ بوم، چتر اور ججر خالی خالی نظروں سے بازار کی گہما گہمی دیکھتے آگے چلتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک جو ذہن پر سنسنی طاری رہی تھی اب پھر ان کے پیروں میں تھرک تھی۔ شام خوب سہانی اور ٹھنڈی تھی۔ سردی کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ بازار میں اندھیرا اترا آ رہا تھا۔ بتیاں روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان کا جو حصہ نظر آ رہا تھا روشن تھا اور [illegible] سفید بادلوں کے ٹکڑے سرخ سنہری روشنیوں میں نہائے پھر رہے تھے۔ رنگین [illegible] خوشبو کی [illegible] کبھی [illegible] کہیں کونے سے قریب سے گزر رہے تھے کہ [illegible] کا حصہ ہو [illegible] ہوئے تھے لیکن اس کا حصہ نہ تھے۔ سرخوشی [illegible] کھلنڈرے پن کی [illegible] ہم [illegible] مجلس [illegible] تھے۔ ہم [illegible] ذہنوں میں [illegible] کی تلاش کی جو پیروں میں [illegible] ایک [illegible] دیکھنے کی [illegible] چلبلاتی [illegible] میں [illegible] تک [illegible] چلانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کی وہاں کوسوں تک [illegible] خبر نہ تھی بازار ختم ہوا تو ساتھ ہی رونق ختم ہو گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں کے سیاہ ہیولوں میں [illegible] کھڑے تھے [illegible] کسی زندہ بشر کی موجودگی کی کوئی آثار نہ تھے گویا [illegible] کا دم [illegible] اور سب کو کھا گیا۔ ادھر ادھر کہیں کوئی [illegible] روشنی [illegible] سڑک [illegible] دور دور کھڑے کھمبے بھی اس دیو کے سحر تلے آئے معلوم ہوتے تھے۔ بجلی [illegible] اور [illegible] اندھیرے میں [illegible] روشنی [illegible] کہیں [illegible] جاتی تھی ہم [illegible] میں پھر پہنچ گئے۔ اب سامنے پہاڑوں کی بجائے [illegible] وادی میں ایک جگنو چمک رہا تھا کسی گھر کا دیا ہو گا۔ بوم نے کہا "ہم [illegible] کونے پر پہنچ گئے ہیں۔ آ اب واپس چلیں۔"

چوزے نے حیرت سے پوچھا "واپس چلیں؟ چھوڑو واپس کیا جانا ہے [illegible] اور وقت دونوں سے آگے نکل چلے ہیں [illegible] اس جہان [illegible] وقت کے غلام [illegible] رہتے ہیں۔ [illegible] ایک وظیفہ کہ [illegible] ہم [illegible] سے اکتا چکے ہیں۔ [illegible] اب دیکھنا چاہیے کہ وقت کے بعد اور اس کرۂ ارض سے آگے کیا ہے۔" بوم نے اس کی [illegible] کو غور سے دیکھا اور چپ کا چپ رہ گیا۔

ججر نے پوچھا، "کھیسے میں کھانا پکا رکھا ہو گا؟"

زاغ نے کہا، "ہونا تو چاہیے، [illegible] کو کہہ کر تو آئے تھے۔"

ججر نے کہا "آہا [illegible] ہم [illegible] گرم گرم روٹیاں کھا رہے ہوں گے" یہ سن کر سبھی کو ایک [illegible] محسوس ہوئی۔ زاغ بولا "یہ چتر کی [illegible] طرحیسی کو کوئی جگنو دینے کی فکر میں ہے [illegible] مرغی کو [illegible] لے گیا۔ بڑا [illegible] کہیں سے چھوٹ نہ پھیر دے۔"

ججر بولا "وہ بھی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں اور پھر چھوٹی موٹی چوٹ سے کیا فرق بھی کیا پڑنے لگا۔"

زاغ نے کہا، "واپس آ جائیں تو ابھی سارا راز کھل کر سامنے آ جائے گا۔"

جہاں سے قہقہے شروع ہوئے تھے واپس پر وہاں تک پہنچے تو وہی گندمی رنگ والی لڑکی سی سیپی کے ساتھ سامنے سے [illegible] قدم تھے۔ ہمارے برابر سے گزر کر آگے نکل گئی۔ سب کو حسرت [illegible] حیرت ہوئی کہ یہ اسی دور کہاں گھوم رہی ہیں۔ ایک دم [illegible] کی گردش تیز ہو گئی۔ جیسے [illegible] ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ [illegible] قدم رک گئے۔ [illegible] صبح بھی کھڑکی میں [illegible] دیکھا تھا۔ بوم نے کہا: "تم لوگ اس قدر حیران کیوں ہوئے ہو؟ [illegible] یہ کوئی تمہارا پیچھا کرتی ہوئی تھوڑا ہی آئی ہیں۔"

زاغ نے سانس پھلاتے ہوئے کہا: "ان سے بات کرنی چاہیے، یہ کالی پیسو ہے۔"

بوم نے کہا: "تجربے کہانی کا شوق ہو تو بسم اللہ کیجیے۔"

چوزہ گھبرایا: "یار ہمیں تو اس قصبے سے بھاگنے کا راستہ بھی معلوم نہیں۔ صبح سے ایک ہی سڑک پر گھوم رہے ہیں [illegible] ہمیں اسی قصبے میں گھومنا ہے۔"

[illegible] لڑکیاں سڑک کے پہلے کنارے لوٹ کر چلتی ہوئی گزریں۔ [illegible]

کالی نے کہا: "آپ ہمارا راستا چھوڑ دیں۔"

زاغ نے کہا: "ہم نے آپ کا راستا کہاں روکا ہے۔ اتنی بڑی سڑک خالی پڑی ہے۔"

سیپی بولی: "جوجی کسی عذاب میں پھنسنا تھا تو تب کہا بھی تھا اتنی دور نہیں جاتے۔"

جوجی نے تنک کر بولی: "آپ زیادہ چالاک نہ بنیں اور ہماری راہ چھوڑ دیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟"

"کہہ دیا نا ورنہ ہم شور مچائیں گی۔"

[illegible] کھسکو [illegible] رہا تھا۔ اسے کچھ کہنے کو نہ تو سوجھ رہا تھا اور نہ ہمت ہی تھی۔

زاغ بولا: "آپ تو ایسے ہی ناراض ہو رہی ہیں۔ ہماری تو ایک معصوم سی التجا ہے کہ ہم بھی [illegible] بیٹھ جائیں، اس میں شور مچانے کی کیا بات ہے؟"

جوجی نے کہا: "تمہارے پاس [illegible] نہیں۔" [illegible] کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔ اس چھڑی سمیت ہاتھ بلند کر کے دونوں کے سامنے کیا اور کہا "چلو سیپی۔" [illegible] چھوڑ دیا۔ [illegible] اس کی پناہ میں [illegible] وہ دونوں [illegible] سڑک پر چلنے لگیں۔

زاغ نے آگے بڑھ کر پھر ان کا راستا روک دیا۔ "کل یہیں اسی وقت ملنے کا وعدہ کریں۔"

"کس بات کا وعدہ کریں؟"

"[illegible] ہم پر رحم کریں۔ ہمیں تو [illegible] کہا جاتا ہے۔" [illegible] کہہ رہا تھا۔

وہ ہنسیں تو جوجی بولی:

"کیا کر رہے ہیں آپ؟ سامنے سے لوگ آ رہے ہیں۔" زاغ فوراً ہٹ گیا۔

[illegible] مستی اور سرور کے عالم میں سڑک سے [illegible] ایک [illegible] چل رہے تھے۔ [illegible] جوجی اور سیپی نے بھی ایک بار پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں:

ان کھنولے بہ از جاؤں

[illegible] ہاتھ نہ آؤں

جب وہ دونوں بازار میں واپس پہنچے تو بوم اور چوزہ ریلنگ کے سہارے اکتائے کھڑے [illegible] کی طرف دیکھ رہے تھے اور [illegible] آلو [illegible] چنوں کا [illegible] اور مہک رہے دی ہیں۔ [illegible] چھوڑا تھا۔ بھوک کی بدولت وہ زیادہ نہ کھا سکے۔ خوشی سے اٹھتے ہوئے خچر اور زاغ نے آ کر پہلے ان سے ہاتھ ملائے اور پھر [illegible] ہو کر معانقہ کیا۔ زاغ نے پوچھا: "کیا کھا رہے ہو؟" بوم نے کہا: "چنے۔ مگر اچھے نہیں۔ تم دیکھو۔" زاغ نے لفافہ لے کر بچے سمیت کے صحن میں پھینک دیا۔ "لعنت بھیجو چنوں پر۔ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ چلو گھر کے بندروں کی طرح کے ہم یہیں ٹہریں [illegible] اور خچر نے جوجی اور سیپی کو گھر تک پہنچا کر آئے ہیں۔ اکیلی لڑکیاں ہیں نا کوئی راستے میں تنگ نہ کرے۔ واپسی پر تمہارے [illegible] لے کر نہیں گے۔ چلو خچر۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ بوم اور چوزہ ہکا بکا رہ گئے۔ بوم نے چلتے چلتے خچر سے پوچھا: "کیسا رہا؟" اس نے عنابی جبڑوں میں جڑے سفید مضبوط دانت نکالتے ہوئے کہا: "زبردست معرکہ رہا۔ آ کر بتاتا ہوں۔"

چوزے نے پوچھا: "بوم، پیسوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

"چنے نے تو ابھی تک کچھ واپس نہیں دیا۔ اس نے خیرات سے بھی بیس روپے ہمارے سامنے قرض لیے تھے۔ ان میں سے تین چار روپے ہار گیا ہو گا۔ اس طرح سولہ روپے تو اس کے پاس تھے۔ چاہتا تو ہمارے دس روپے واپس کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کیے۔ جب مانگتی ہوں کہتا ہے کہیں بھاگا جا رہا ہوں؟ جب تمہارے ختم ہو جائیں گے لے لینا۔"

چوزے نے مایوسی سے کہا: "وہ تو نہیں دے گا۔"

ہوم بتانے لگا، "تیس روپوں میں سے اب میرے پاس کوئی تیرہ روپے چھ آنے رہ گئے ہیں۔" پھر پیکٹ نکال کر سگریٹ گنے اور گویا ہوا، "یہ چار سگریٹ ہیں۔ اب یہاں سے نیا پیکٹ بھی خریدنا ضروری ہو گیا۔ یوں سمجھو کہ باقی ستره روپے بارہ سے بچے ہیں۔"

جورہ بولا، "واپسی پر کب خرچ ہے گا؟ ریل کا تو [illegible] آدمیوں کا واپسی کرایہ لگے گا، یہ لیے ہم نے اپنی آدھی بوتل گلاس بیچ کر حصہ ڈالا تھا لیکن اب بس کا کرایہ تو دینا ہو گا تم ہو ورنہ؟"

"بارہ بارہ آنے۔"

"گیارہ روپیہ ہو گیا۔ باقی بچے سولہ روپے چار آنے ابھی کھانے پینے کا خرچ، خیمے کا کرایہ [illegible] ابھی چار دن اور ہمارا رہنا ہے۔ ان روپوں میں ہم دو آدمیوں کی گزر کیسے ہو گی؟ تم تو سگریٹ بھی راحت سے پیتے ہو، ایک ایک دوپہر میں خرچ کا پلا دیا تھا، سفر میں اس کے باوجود پورے دن میں صرف [illegible] ہم در اصل پہلے سے بہت زیادہ مجبوری کی حالت میں آ کر پھنس گئے ہیں۔"

ہوم ذرا تیز ہوا، "یار کیسی باتیں کرتے ہو، یہ چتر [illegible] اور دماغ کون سے بھلا امیر ہیں؟ [illegible] اور خرچیسے تو خیر میں مانتا ہوں کہ دولت مند لوگ ہیں۔"

جورہ کہنے لگا [illegible] روپے [illegible] دوستی سو روپے اپنی ذات پر خرچ کرنا اس کے لیے بھی کوئی مشکل نہیں۔ پانچ مربع زمین کا اکیلا مالک ہے، باپ سر پر نہیں، جس سے مشکل کی مصیبت ہو۔ سارا آمدن اس کے پاس ہوتی ہے، اس کو جو چاہے بہانہ بنا کر ستا دے، وہ کون سی نقشیں کر سکتی ہے، سگریٹ وہ نہیں پیتا، شراب وہ نہیں پیتا، تم تو جانتے ہو ہوشیار آدمی ہے اور ہوشیار آدمی غریب نہیں ہو سکتا، وہ جب چاہے پکڑ دے ادھر ادھر سے پیسے مار لیے، ہم تو ہمارے جیسا غریب ہی لیکن پھر وہ جوا جیتا ہے اور دوسرے خوش قسمتی سے چتر سے اس کی کوئی گہری دوستی نہیں جو اس کو پانچ روپے دے۔" اتنا کہہ کر جورہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر ایک کرب بھری آواز میں کہنے لگا، "ہم اگر خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے تو ہمیں یہاں کی سیر پہ نہیں آنا چاہیے تھا۔ گھر والوں کو میں نے تنگ کر کے ان سے بیس بیس روپے اکٹھے کیے اور خود بھی ذلیل و خوار ہوئے، تمھیں تو پتا ہی ہے کہ میری سوتیلی ماں ہے۔ میں دس دن تک مسلسل باپ سے تقاضا کرتا رہا تو اس نے ان سے چھپ کر یہ بیس روپے دیے۔ اور کب سے بیس روپے بڑی رقم ہوتی ہے، تم نہیں جانتے کس شکل سے دے رہا ہوں۔ تمھاری ماں زندہ ہوتی تو کبھی نہ دیتا، لیکن دل میں تمھیں انکار کرنے کا وسعت نہیں۔ میں نے دل چاہا کہ روپے اسے واپس کر دوں اور کہوں کہ پروگرام منسوخ ہو گیا ہے، پھر یہ سوچ کر وہ پیسے دیکھتے ہوئے اسکارٹ میں سے جیب میں ڈال لیے کہ اتنا پروگرام بن چکا تو بعد اب اگر میں یہیں جاتا تو دوستوں میں بہت سبکی ہو گی۔" کہیں سے ایک دم ٹھنڈی تیز ہوا اٹھی، گرم کوٹ جو صبح سے مصیبت بنا ہمارے ایک بازو سے دوسرے بازو پہ منتقل ہو رہے تھے، ہم نے اس سردی کو غنیمت جانتے ہوئے جھٹ پہن لیے۔

جورا بتانے لگا، "اگر مجھے گھر میں رہتے دیکھو تو سمجھو کہ میں بھی جیسے مسافر ہوں

جو چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کھانا وقت پہ مل جاتا ہے، اور جو بھی گھر میں پکا اس میں سے اچھا اور وافر حصہ ملتا ہے۔ میرے کپڑے بھی دھو دیے جاتے ہیں، لیکن بات نہیں کرتی، جس کو میں طعنہ و طنز کے طور پر نہ شکوہ و شکایت کے طور پر۔ چاہے کچھ ہو جاتے، کبھی کوئی کام نہ کہے گی۔ میں نے ایسے اس کے چہرے پر نہ کسی حسد کی وابستگی کی دیکھا نہ کسی مایوسی کی امید کے آثار پائے۔ ایک مکمل عدم اور کلی عدم تعلق کا رشتہ ہے، ہمارے ایک پابندی سے برابر چلتے ہیں، وہ میرا ساتھ سے چل رہا ہے۔ ہم گھر کے دو مہرے سامنے رکھتے ہیں، یہی اپنی معزرتوں کے حالوں میں محصور رہتی ہیں۔ وہ کبھی کوئی بات بولی، اور میں خوش ہوں، یا خدمت کے کسی رشتے سے متوجہ کر سکوں، ایسا نہیں ہوا۔ ہم دونوں اس بے گمان گزرنے پر مجبور ہیں کہ دوسرا موجود تو کیا، دنیا سے غائب ہی ہے۔ ہوا، اس لیے اس کے چار بچے پیدا ہوئے، دو لڑکے دو لڑکیاں۔ اس نے انھیں کیسے پالا ہے، یہی مجھ سے کبھی نہ انھیں سنبھالنے یا دیکھنے کی فرمائش نہیں کی، اور نہ میں نے کبھی خدمت کی ہی رضاکارانہ پیش کش کی، بچے بڑے ہو رہے ہیں، اور لڑکے اسکولوں میں اور چھوٹا پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ایک بہن پانچ سال کی ہے، ایک چار سال کی، لیکن ایک بات جو ان بچوں میں مشترک ہے، میرے سے ان کے چہروں پر ناشناسی ہے۔ جو ان کی ماں۔ جب وہ ان کی شکل میں ہی ہوتے ہیں، جس میں اتنا چہرہ جیسے مسکراہٹ کی جگہ ان کے چہروں پر لگا دیتی ہے، میں چاہتا ہوں اس جہنم سے کہیں نکل بھاگوں، مگر کہاں نکل بھاگوں! یہی بزدلی اور کمزوری سے ہوں جیسے وہ سامنے کھڑا پھر رندہ رہنے کی مجبوریوں کی باعث زمین سے بندھا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا مسخرہ اور نیچے ہوا، جیسے آنسو پی رہا ہو۔ عجیب تضاد تھا کہ بے مدد بیگانگی کی یہ کیفیت اور گھر کے باہر جس کا ذکر جب اس نے کیا! اور صاحب چند اس کی صحبت کے ٹھکانوں کی بھی فہرست نہ بنا رہا ہو سکے، اور نہ باہر ٹھکانوں خوف سے نکلا جا سکے۔

آگے میں چتر اور خرچیسے بازار میں آتے دکھائی دیے۔ چتر بہت خوش نظر آ رہا تھا، خرچیسے کچھ چھپا چھپا سا تھا۔ بازار میں چند لوگ جو ہمیں تک کھڑے رہے تھے، انھوں نے نگاہ ڈالی۔ جلدی جلدی ہم اپنے ہوٹلوں اور گھروں کے راستوں پر ہو لیے۔ چتر ہنس ہنس کر رہا تھا، ان دونوں کے پاس پہنچے، ہنسی سے بے حال پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ خرچیسے کے چہرے پہ خفت اور ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ چھپی ہے۔ کہنے لگا، "یہ تیسے و فضول ہنسے جا رہا ہے۔"

جورہ اور ہوم وجہ جاننے کو بے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے، "چتر، بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟"

چتر ہنسی کے دورے سے سنبھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی قریب تو نہیں، جب اطمینان کر لیا کہ کوئی پاس نہیں تو بولا، "یار وھسکی کا موسم ہو رہا ہے، پینی چاہیے۔" پھر کوٹ کی جیب سے آدھا نکال کر کوٹ کے پلو کی اوٹ میں ڈھکن کھولا، بوتل سے ایک بڑا گھونٹ بھرا، بوتل کوٹ کے اندر بغل میں چھپاتے ہوئے کہا، "سے پوچھو کوئی اور صاحب شوق

کریں گی؟" سب نے حیرت سے دیکھا۔ "نہیں" اس نے ڈھکن لگا کر بوتل جیب میں رکھی، سگریٹ سلگایا اور کہا، "چلیں؟"

یوم نے کہا "ابھی تو راج اور جیجر کو آنا ہے۔ ہم پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا [illegible] تو کہہ رہا تھا چلیے، پہلے بتا کر ہوا؟"

جیٹر نے خرجیسے سے پوچھا۔ "بتا دوں انہیں؟ دیکھو تو پھر مزا ہی نہ ہوتا۔"

خرجیسے نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں [illegible] اور [illegible] یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تو پھر میں شروع سے سناتا ہوں۔ ہمارے شہر میں پنگو انڈینوں کی ایک بہت بڑی تعداد ریلوے میں ملازمت کرتی ہے۔ ان کا [illegible] محض واسطہ، صرف ایس تک محدود ہوتا ہے اپنے طبقے کے اندر مقید۔ وہ اس شہر میں یوں زندگی گزار رہے ہیں جیسے کسی بند ڈبے کے اندر زندہ رہے ہوں۔ ان میں سے ہر فرد منتظر ہے کہ ریٹائر ہو تو پنشن [illegible] کو لے کر بیک ہوم یعنی انگلستان پہنچ جائیں۔ عام لوگوں سے روزمرہ ضروریات کی حد تک ان کا ربط ضروری ہو بس اتنا ہی رکھتے ہیں۔ شہر والوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس انگریز کی مخلوق کو پنگو انڈین کہا جاتا ہے اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے ساتھ اسی شہر میں بستے ہیں۔ جو ان سے متعارف بھی ہیں اور جو نہیں انگریز سمجھتے ہوئے سہمے سہمے، خائف سے بچ کر نکل رہتے ہیں۔ [illegible] خائف سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایک گروہ دوسرے سے جذباتی طور پر قطعی کوئی ربط نہیں رکھتا۔ ان میں سے بیشتر ایسے خاندان ہیں کہ جو ریلوے کلب میں آتے ہیں۔ میرے بھائی چونکہ ریلوے کا افسر ہے، اس واسطے میں بھی ہر شام کلب میں جا گھستا ہوں۔ ریلوے میں پنگو انڈین گارڈ ہے مسٹر جیمز [illegible] وہ لاہور اپنی [illegible] کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ وہاں ریلوے میں کوئی چھوٹا موٹا افسر تھا، اور وہ کسی حادثے میں مارا گیا۔ بیوہ ہو کر اپنی دو چھوٹی چھوٹی بچیوں کو ساتھ لیے، یہیں جہلم کے پاس چلی آئی۔ چھ مہینے تک اس کے پاس رہی۔ اس اثنا میں میری اس سے دوستی ہو گئی، بلکہ یوں کہو کہ اچھی دوستی ہو گئی [illegible] ریلوے کی طرف سے [illegible] اس پہاڑی قصبے میں ایک بنگلا کرائے پر لے [illegible] وہ گیسٹ ہاؤس چلانا شروع کر دیا اور [illegible] میں [illegible] سکھانے کی [illegible] میرے ساتھ اس کی خط و کتابت تھی۔ میں نے آج خرجیسے سے کہا کہ چلو تمہیں ان لوگوں سے ملاؤں۔ اس کی چھوٹی بیٹی مارتھا [illegible] خوبصورت کہ [illegible] دیکھتا رہ جائے۔ اس پر خرجیسے نے سر ہلا کر [illegible] کی اور کہا، "وہ بہت خوبصورت ہے۔ دودھ جیسا گورا رنگ [illegible] مگر وہ تو [illegible] لگتی ہے۔" جیٹر نے کہا "میں تو [illegible] سمجھ رہا تھا کہ معاوضہ تو میں کر دوں گا [illegible] ہم جاتے ہوئے دو ڈبے وسکی کے لے گئے تھے۔ خالی ہاتھ جانا تو نامناسب تھا۔" یوم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "مجھے یوں نہ گھورو۔ وسکی کے چالیس روپے اس نے خرچ کیے ہیں۔ بچوں کے لیے دو [illegible] کے پیکٹ میں اپنی گرہ سے لے گیا تھا۔ خیر!

پھر ہم وہاں پہنچ گئے۔ ریسپشن پر ایک کلرک کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میڈم کو اطلاع کرو، جیٹر آیا ہے۔ اطلاع پا کر وہ دوڑی ہوئی آئی اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میں نے ایک [illegible] وسکی کا اسے پیش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ کچھ زیادہ [illegible] ہو جاتا اور [illegible] کی عادت پڑ جاتی۔" یوم بیچ میں بول پڑا "تم نے تو دو خریدے تھے [illegible] کہ ایک تم ہی [illegible] ورنہ پوری بوتل خریدتے یا پھر ایک ہی ادھا لیتے۔" جیٹر نے کہا "چلو ایسے ہی سہی، اس میں کیا حرج ہے۔ اچھا تو میں بتا رہا تھا کہ پھر اس کی ماں اور مارتھا، ہیلن کی دونوں لڑکیوں کو لے آ گئیں۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور لڑکیوں کو ایک ایک پیکٹ ٹافیوں کا دے دیا۔"

خرجیسے بولا "وہ لڑکی تو اس سے ایسے مانوس تھی جیسے یہی ان کا باپ ہو۔"

جیٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے اس کی بیٹیوں سے متعارف کرایا۔ بہت [illegible] خرجیسے۔ اس نے دیکھا کہ میں نے ان سے ہاتھ ملائے ہیں تو چاہیے تھا کہ تعارف کرانے پر یہ بھی ان سے ہاتھ ملا لیتا مگر ہمارا یار دقیانوسی اور بزدل ہے۔ رنڈیوں سے خوب کھل کھیلتا ہے [illegible] خواتین سے ملا تو [illegible] ہو گیا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کر کے بیٹھ گیا۔ مارتھا اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان کی ماں اندر چائے لینے چلی گئی۔ ہیلن نے اس سے پوچھا، "ہاؤ ڈو یو ڈو [illegible]؟" یہ کہنے لگا، "[illegible] مسلم [illegible]" میں ہنس پڑا۔ ہیلن پوچھنے لگی "[illegible]؟" میں نے کہا "اس کے نام کے معنی [illegible] بتاتا ہوں، معنی ہیں کرائسٹ [illegible]" مارتھا اور ہیلن دونوں ہنس دیں۔ ہیلن کہنے لگی [illegible] ہو۔ مسٹر کرائسٹ [illegible] بچی قالین پر بیٹھنے لگی [illegible] وہ [illegible] میں مصروف ہو گئی [illegible] مارتھا [illegible] بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا جیسے پتھر کا [illegible] چلانے کے لیے ہیلن نے پوچھا "مسٹر کرائسٹ [illegible]" اس نے [illegible] اس کی طرف دیکھا اور فرمایا، "[illegible] انگلش [illegible]" [illegible] کر خاموش ہو گئی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ہیلن کہنے لگی [illegible] مسٹر کرائسٹ [illegible]" بات یہاں تک پہنچی تھی کہ جیجر اور راج آ گئے۔ جیٹر کہنے لگا "چلو اب چلیں، بار خالی ہو گیا ہے۔ دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے اور ہمیں بہت دور پہنچنا ہے۔ باقی قصہ خیمے میں بیٹھ کر سناؤں گا۔"

ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے لباس کبھی سمیٹ دیتی، کبھی [illegible] سے لپیٹ دیتی اور کبھی رنجیدہ ہو کر انہیں [illegible] مگر اس کی [illegible] دل کو خوش کرنے والی تھی۔ ہم راج اور جیجر کی لائی ہوئی پنیر اور پھل کھاتے ہوئے [illegible] کے رخ چل پڑے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ غروب آفتاب کے بعد [illegible] تو کوئی [illegible] نہ جاتی ہے۔ جیٹر نے تجویز دی کہ "پکی سڑک والا راستہ بہت لمبا ہے۔ میں آپ کو پہاڑوں پر سے خیمے تک پہنچا سکتا ہوں۔ کچھ ایسا دشوار گزار بھی نہیں ہو گا اور فاصلہ تو آدھے سے بھی کم ہو گا۔ میں پہاڑوں میں پیدل سفر کرتا رہا ہوں۔ میں بخوبی پہچانتا ہوں کہ ہمارا خیمہ اسی پہاڑ پر ہے جس پر یہ قصبہ آباد ہے۔

پس سمت کا خیال رکھنا ہے، اور جس فن میں ماہر ہو۔ ہم بلاوجہ کیوں اتنا لمبا چکر کاٹیں؟
سب تھکے ہوئے تھے [illegible] فاصلہ [illegible] ہونے کے لالچ میں مان گئے۔ چتر نے [illegible] ہم آج دن میں پہلی دو مرتبہ [illegible] سارے جسم پہ [illegible]
"فکر نہ کرو [illegible] رہی گی۔"

ہم سب اس سے قدم ملا کر چل پڑے۔ سڑک کی روشنیاں ختم ہو گئیں۔ آگے درختوں اور پہاڑوں کے ہیولوں کے سوا ہر طرف بس گھپ اندھیرا [illegible] گہرا سکوت اور [illegible] مکمل ویرانہ چھایا تھا کہ طبیعتیں گھبرا گئیں اور خوف سے دل [illegible] کی صورت اس طرح دھڑکنے لگے لیکن ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ [illegible] سیدھا راستہ [illegible] کیوں نہ [illegible] پکی سڑک [illegible] چھوڑ دیا [illegible] ہم [illegible] چلتے رہے تھے، اب تین تین کی دو سطروں میں بٹے پتھروں پہ چلنے لگے۔ یہاں قدم قدم پہ جوتے پھسل پھسل جاتے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم اندھیرے میں ہیولوں کی ساخت اور فاصلے کا بھی صحیح تعین ممکن نہ تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے کیا ہے۔ اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارا قیاس تھا کہ ہم اسی جنگل روڈ پہ چل رہے ہیں جو آج صبح اور شام کو ہم نے دور سے دیکھی تھی۔ [illegible] طرف سمندر [illegible] گہری وادی ہو گی۔ جس میں اب جگنو سا چمکتا کوئی دیا بھی نہیں [illegible] اسی راستے کا [illegible] کر دیا تھا، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ [illegible] کے عذاب میں کہیں آ [illegible] اور بے منزل راہ پر چلتے رہے تو وہ جنگل روڈ بھی ختم ہو گیا۔ راستہ متواتر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ [illegible] پگڈنڈی پر پہنچ گئے تھے [illegible] ایک کی کہری قطار میں پھونک پھونک کر قدم دھرتے ہوئے یوں محسوس کر رہے تھے گویا کسی [illegible] کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ اگلا قدم پگڈنڈی پہ پڑے گا یا کسی کھائی [illegible] صرف آگے ساتھی کی پشت کا سایہ سا [illegible] دیکھ سکتی تھی۔ تعجب تھا کہ اس اندھیرے میں ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے تک بھی دیکھنا کیوں کر ممکن ہے۔ پتا چلا کہ اندھیرے سے خوگر ہو کر انسانی آنکھ میں اتنا دیکھ سکنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے [illegible] کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ ہر کسی کو بس اتنا پتا تھا کہ وہ چل رہا ہے اور اگرچہ اس کا پاؤں بار بار پھسلا ہے لیکن ابھی تک [illegible] کہ یہاں جنگلی جانوروں کا خطرہ ہو سکتا ہے؟

چتر نے کہا "میں سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہاں کوئی شیر چیتا نہیں ہے۔ گیدڑ بھیڑیے ہیں اور وہ ہماری بو پا کر بھاگ گئے ہیں۔"

[illegible] ہم [illegible] مسلسل چل رہے ہیں [illegible] اگر

چھوٹا تھا سو ہم ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟ ظاہر ہے یہ سوال چتر سے تھا، اور جواب بھی اسی نے دیا: "شروع میں یہ اندازہ نہ لگایا کہ اندھیری رات میں بادل چھا کر ستاروں کو اندھا کر سکتے ہیں اور وہی ہو کر رہا۔ اب پگڈنڈی یہ راستا ہی ہر قدم پہ زمین پہ جھک کر ہاتھوں سے ٹٹول کر تلاش کر رہا ہوں۔ مگر کوئی بات نہیں، تھوڑی سی ہمت اور درکار ہے۔ منزل آیا چاہتی ہے۔"

زاغ نے کہا، "یہ اندازہ تو تمھیں لگانا تھا۔"

چتر جھنجھلا کے بولا، "خیر سے آپ بھی عاقل و بالغ ہیں۔ خود اندازہ لگا لیتے، اور ادھر سے نہ آتے۔"

پہلے سے سہمی ہوئی [illegible] چتر کو [illegible] دیکھ کر [illegible] پڑے۔ "اپنی چالاکی دکھانے کے شوق میں ایک تو [illegible] اور ہمیں بلاوجہ اس جان لیوا مصیبت میں پھنسا دیا اور اوپر سے غصہ کر کے دکھاتا ہے۔ پتا نہیں ابھی ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

اتنے میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ [illegible] سے گرنے کی اور اس [illegible] جیسے کوئی بھاری چیز ڈھلان پہ پھسلتی چلی گئی ہو۔ [illegible] سے توجہ ہٹی اور کوئی گر گیا۔ چتر نے آواز دی، "کون گرا ہے؟"

کوئی جواب نہیں۔ ایک مکمل سکوت اور خاموشی۔ ہر شخص جن قدموں پہ تھا، وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔

چتر نے کہا، "اپنے اپنے نام پکارو؟" زاغ، [illegible]، جوزف، [illegible]

"[illegible] یا تو بے ہوش ہے یا بہت نیچے کہیں کھڈ میں جا گرا ہے۔"

زاغ نے کہا، "یا مر گیا ہے۔"

چتر نے [illegible] کہا، "یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

زاغ نے کہا، "حرام زادے، تو ہمیں اچھے راستے سے لایا ہے؟"

چتر نے تحمل سے کہا "دیکھو! یہ [illegible] کا وقت نہیں۔ ہمیں [illegible] کو تلاش کرنا ہے۔ جس جس کے پاس ماچس ہے [illegible] ایک ایک تیلی ہاتھوں میں پکڑ لو۔ میں [illegible] کہوں [illegible] جب میں کہوں تو سب تیلیاں یکبارگی روشن ہوں۔" ایسا ہی کیا گیا۔ بائیں طرف ڈھلان پہ کوئی پگڈنڈی سے [illegible] نیچے جھاڑیوں میں [illegible] پتھر سے [illegible] کی طرح [illegible] ایک گٹھری نظر آئی۔ [illegible] پہلے سے بھی زیادہ اندھیرا [illegible] پڑا۔ چتر نے کہا "اب کوئی [illegible] نہیں۔ قریب ہی [illegible]" پھر آواز دی، "[illegible]" [illegible] کی ایک ہلکی سی [illegible] آواز آئی۔ چتر نے کہا "[illegible] اب ہم تیلیاں جلاتے جاتے ہیں، تم آہستہ آہستہ ان کی روشنی میں باہر آ جاؤ۔"

"میں تو [illegible] ہوں۔ مگر اٹھ نہیں سکتا۔"

چتر نے کہا، "[illegible] دیکھو ہم [illegible] کوشش کرو۔" ہم سب وہیں پگڈنڈی پہ بیٹھ گئے۔ [illegible] بھی جب وہ باہر نکلنے کے لیے کسی طرح [illegible] کوشش کرے [illegible] نہ کر

سکا، تو زاغ نے کہا: "اس نے گر کر ہی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ چلو اب چھوڑو اسے۔ زندہ تو ہم صبح آ کر نکال لیں گے۔"

ایک سیکنڈ تک، جو بہت بوجھل ایک سیکنڈ تھا، سکوت اور خاموشی طاری رہی، جیسے لوگوں کے ضمیر [illegible] زاغ کی تجویز کو رد کرنے کی [illegible] سے دست و گریباں رہے ہوں۔ سب سے پہلے پھر ایک بوم [illegible] بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سوچو ہم میں سے کوئی بھی گر سکتا تھا۔" پھر بوم اور چوزہ بولے۔ "بس تم جانا ہے چلا جائے۔ جب تک خرو نہیں نکلتا، ہم یہیں بیٹھے ہیں، چاہے صبح ہو جائے۔ کیوں خچر؟"

خچر نے کہا: "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

چتر نے خرو سے پوچھا: "خرو، تمہاری کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹ گئی؟"

"پتا نہیں۔ میرا بایاں پاؤں [illegible] بوجھ نہیں [illegible]۔ حادثے کے بعد پہلی بار اس کی آواز میں [illegible] معصوم ہوئی

بوم نے پوچھا "باقی تو سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں، باقی ٹھیک ہوں۔"

چتر نے کہا "اچھا یوں کرو [illegible] گھسٹتے ہوئے ذرا اوپر آ جاؤ پھر ہم تمہیں کھینچ لیں گے۔"

چتر نے خچر کی [illegible] اور چوزے کی [illegible] اور بوم [illegible] پھلا کے پیچھے جھک [illegible] خرو کو بدقت اوپر کھینچا گیا۔ زاغ [illegible] کی طرح الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ خرو باہر نکل کر [illegible] میں بیٹھ [illegible] سانس درست کرتا رہا۔ ہم سب نے [illegible] جلا جلا کر اسے ہر طرف سے دیکھا۔ وہ ابھی تک خوف سے لرز رہا تھا، اور بار بار کہہ رہا تھا، "میں ٹھیک ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔" جیسے اپنے آپ کو اپنی سلامتی کا یقین دلا رہا ہو۔ اس کے کپڑے [illegible] چہرے [illegible] پر کچھ پشیمانی اور زمانہ بھر [illegible] دکھائی دے رہا تھا۔ ہر شخص خوش تھا، شاید خرو کی زندہ سلامت شکل اس پر یا اس خوش قسمتی پر کہ وہ خود حادثے کا شکار نہیں ہوا۔ چتر نے کوچ کا بگل بجایا۔ سب چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ طے [illegible] کہ ہم میں سے ہر ایک باری باری [illegible] قدم تک خرو کو سہارا دے گا اور وہ ایک پاؤں پر پھدک پھدک کر چلے گا۔ ہم [illegible] کی ایک پتلی سی پسلی پر چلتے چلتے تقریباً اس کے اوپر پہنچ [illegible] اور [illegible] وہاں سے [illegible] اور جھاڑیوں [illegible] شروع ہو [illegible] جس کے وسط میں کہیں [illegible] ہے۔ خرو ایک ہاتھ [illegible] ہوئی چٹان کے ساتھ ٹکا کر اور دوسرا ساتھی کے کندھے پر رکھ کر پھدک پھدک کر چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ ہوا کچھ دیر سے [illegible] اور اب پھر [illegible] شروع ہو گئی [illegible] کے خوف سے ہماری رفتار اور کم ہو گئی۔ جب تک چڑھائی چڑھ کر [illegible] اور گھنی [illegible] پاؤں پکڑنے والی گھاس کے میدان میں پہنچے تو سیلاب میں پھنسے ہوئے چوہوں کی طرح بھیگ چکے تھے۔

میدان کی سطح [illegible] بلکہ [illegible] سے بنی پانچ پانچ فٹ اونچی [illegible] میں جس [illegible] ہم کئی بار کھمبوں کی طرح

بار بار [illegible] جیسے خرو [illegible] کے ساتھ ہی ایک چیخ بھی بلند ہوئی۔ جس پر ہم بھی ہنسے اور کھسیانی ہنسی ہنس [illegible] خرو بھی ہنسا۔ ہم بہت دیر تک یونہی اس جنگل میں چتر کی رہنمائی میں چلتے رہے لیکن کیمپ کو ڈھونڈ کر [illegible] کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ خرو کی زندہ سلامت کھڈ سے نکلنے کی خوشی اب ختم ہو گئی تھی اور ہم سفر سے مایوس ہو کر ایک بار پھر بددل ہونے لگے تھے۔

زاغ بولا "چتر میں نے تو پہلے ہی کہا تھا [illegible] سمت کا تعین نہیں کر سکتا اور اب ان جنگلوں میں ہمیں کسی وحشی جانور کے ہاتھوں شکار کرا دے گا۔"

بوم بولا "ہمیں بھلا سیدھا راستہ چھوڑنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ چاہے وہ لمبا ہی تھا [illegible] تک کبھی کے کھانا کھا کے خیمے کے اندر گرم بستروں میں سو رہے ہوتے۔ اس نے ہمیں خواہ مخواہ مروا دیا۔"

خچر نے کہا: "چتر، کیا ہم ساری رات اسی جنگل میں مارے مارے پھرتے رہیں گے؟"

چوزہ بولا "سردی اور بارش نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیے ہیں۔" اس نے ثبوت کے طور پر دو تین چھینکیں ماریں۔

خرو نے کراہتے ہوئے تجویز دی "یوں کرو تم لوگ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں بالکل بھی نہیں چل سکتا۔ خیمہ مل جائے گا تو مجھے آ کر لے جانا۔"

"تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" چتر نے کہا اور [illegible] گھاس [illegible] چلتا چلا گیا [illegible] آگے نکل گیا۔ مشکل سے [illegible] گزرے ہوں گے کہ وہ واپس آ گیا۔ [illegible] سامنے مربع [illegible] جس کی باہر [illegible] اندر [illegible] ہے۔ اس سے آگے ہمارا موعودہ خیمہ نصب ہے۔ تمہارا منتظر [illegible] چلو۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم خیمے تک پہنچ گئے ہیں۔ [illegible] ایک کونے [illegible] روشنی [illegible] سامنے کھڑا تھا۔ ہم دوڑتے جیسے بچے اسکول سے چھٹی پا کر دوڑتے ہیں۔ [illegible] خرو بھی بغیر سہارے کے [illegible] چال پہ کچھ کچھ بوجھ [illegible] پیچھے پیچھے لنگڑاتا چلا آ رہا تھا۔ جب خیمے میں پہنچے تو بارش کا پانی کپڑوں سے نچڑ رہا تھا۔ پہلے سے روشن لالٹین کی [illegible] روشنی [illegible] لگ [illegible] جیسے [illegible] زمانے کے بعد ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ اتنا بہت سا وقت گزرنے پر بھی شکلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بوم بولا "آج بہت تکلیف اٹھائی [illegible] گزشتہ موت ہمیں صرف چھو کر گزر گئی۔ کیا بجا ہوگا؟"

کسی نے بتایا، "دو بج رہے ہیں۔"

زاغ بولا "[illegible] اس وقت پلاؤ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہوگا اور سامنے [illegible] اور [illegible] ناچ رہی ہوں گی۔"

چتر نے جیب سے بوتل نکال کر ہوا میں بلند کرتے ہوئے نعرہ لگایا، "ہمارا جمیلہ کہاں ہے؟" اور ایک لمبا گھونٹ کھینچا۔

صبح ہوئی تو ہر ایک بستر سے یوں ناٹھاں اٹھا جیسے صدیوں سے بیمار ہو۔ چوزے کو تو باقاعدہ بخار ہو گیا اور وقفے وقفے سے ایسی کھانسی اٹھتی کہ لگتا ابھی پھیپھڑے باہر پھینک دے گا۔ خرو کا یہ حال تھا سوچ کر کیا ہو رہا تھا اور بغیر سہارے کے ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ بوڑھا باری صاحب بیٹھے سے بڑا مطمئن ہو رہے تھے۔ بارش رات بھر جاری رہی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ابھی بھی ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ ملازم صبح صبح ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اور گرما گرم چائے کا پیالہ اس نے فرنے میں سجا کر ہر ایک کو بستر میں پیش کر دیا۔ ہم میں سے ہر شخص بستر میں سکڑے سے کمر لگائے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ شیشہ باہر سے بھیگا ہوا تھا۔ خیمے میں رہنے کا پہلا اصول یہ وضع ہوا تھا کہ ہر کوئی اپنی ذات اور اپنی چیزیں اپنے بستر کی حد تک پھیلا سکتا ہے۔ خرو کی علاقہ میں شروع ہوا تو دوسرے آدمی کو اختیار تھا کہ آپ کی ذات یا آپ کی املاک جو اس کی حدود کی خلاف ورزی کریں ان سے جو سلوک چاہے روا رکھے۔ بیشتر وقت سلوک ایسا ہی روا رکھا جاتا جو روسی بادشاہوں کے مابین ہوا کرتا تھا لیکن کبھی کوئی مکھو بھی جاتا۔ صبح صبح جب جو کسر کا موڈ بنا ہوا تو خجر نے اپنے نام کی لاج رکھے۔ ملاں کیا کہ اس کے بستر پر کسی کی قمیص آ گئی ہے۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر انگلی کے اشارے سے ہر کسی کو وہ قمیص دکھائی۔ قمیص اسری کو شب بے شہد رکھی تھی۔ خجر نے دوبارہ موقع نہیں ہونے دیا کہ اس کا مالک فوراً سے جا نہ سکیں تو وہ باہر بارش میں پھینک دے گا۔ ہر ایک نے قمیص پر نظر ڈالی۔ چوزے بھی بیماری کی باوجود قمیص دیکھنے کے لیے اٹھا۔ خجر نے اسری و رنگ دی اور پھر قمیص کچھ سمجھ کر کے خیمے سے باہر پھینک دی۔ وہ پڑی مینہ میں بھیگتی رہی۔ کوئی پانچ منٹ گزرے ہو خجر جو سکڑے سے کمر لگائے بیٹھا تھا یک دم "اوہ" کہتے ہوئے اٹھا اور بڑی رفتاری سے باہر لپکا۔ "میری اصلی قمیص مینہ میں برباد ہو گئی؟" ہر کسی کے حلق سے یک دم قہقہہ ابلا۔ اور خجر بھیگی سمٹی بھیلالی کھڑا افسوس سے سر ہلا رہا تھا۔ خجر کی اس حواس باختگی پہ سب بستروں پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اسے کیا جیرکی کے طعنے نہ دیے۔ وہ سر ہلا ہلا کر بس جزی قمیص کی خراب ہونے پر افسوس کرتا رہا۔

خرو کو دفعتاً شراب یاد آ گئی۔ لیٹے لیٹے چتر کو مخاطب کر کے پوچھا "اوئے، وہ رات والی شراب کہاں گئی؟" اس نے کونے میں منہ کر کے رکھے کوٹ کی جانب اشارہ کیا "پڑا ہے جیب میں ویسی کی ویسی۔ رہی چند گھونٹ جو تمہارے سامنے لیے تھے۔ اس کے بعد کہاں پی ہے۔ رات تو سب کر کے ہمارے ہوش گم کر دیے۔ شراب کسے یاد رہتی؟"

"تو نکالو اب پئیں۔"

چتر نے کہا "تم رہنے دو۔ یوں کی وجہ یہاں یہ بھنگ نہیں شراب ہے۔ یہ انگریز کا مشروب ہے اور اس کے پینے کے کچھ آداب مقرر کیے ہوئے ہیں۔ یہ ساری میں کہ جب چائے کی پیالا بھر اور اٹھا کے منہ سے لگا لو۔ جیسے موسیقی کی طرح اس کے اوقات مقرر ہیں۔ وسکی غروب آفتاب کے بعد ہی حلق میں جاتی ہے اور صبح میں لگ لپٹ کے کام کرتے ہیں۔ اس سفر میں کچھ تو عقل کی باتیں سیکھ لو مجھ سے۔"

ناشتے میں ناشتہ؟ کیا۔ سب نے دات کے کھانے چورا لیا رہا اور سب کے اصرار کے باوجود کسی

چیز کو منہ نہ لگایا۔

چتر نے پوچھا، "ہاں بھائی، آج کا کیا پروگرام ہے؟"

یوم نے کہا "چھوڑو پروگرام کو۔ یہی تک کی مہکومت ہی میں ہونی چوزے بھی ٹھیک ہو کر چلیں گے۔ آج پتا نہیں ٹورنٹ بھی کس وقت واپس پہنچے۔"

چتر نے کہا "ہم تو یہیں سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ آج کی رات اس کے کیمپ باڑے میں گزاریں گے۔ تو کوئی بات نہیں۔ تم لوگوں سے کل دوسروں کے سامنے ملاقات ہو جائے گی۔ کیوں خرو؟"

وہ بولا "ہاں جی۔ یہاں تو ہمیں کل ہی مہم اسے دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے قسمیں دے دلا کر اس نے ایک دن کی مہلت دی تھی۔ میں قصبے میں اپنا نسخہ بھی کسی ڈاکٹر کو دکھا لوں گا۔"

زاغ اور خجر بھی تیار ہو گئے کہ چوری اور سیمی کو ایک نظر دیکھ لیں اور شام تک پلٹ آئیں گے۔ اس اثنا میں بارش رک گئی تھی اور بادل کہیں غائب ہو گئے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ مکھوی ہوئی دھوپ میں پوری فضا آئینے کی طرح صاف شفاف چمک رہی تھی۔

یوم نے پوچھا "خرو، وہاں پیدل کیسے پہنچو گے؟"

اس نے کہا "پیدل تو ہم ایک عمر میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہاں سے بس لیں گے۔ چاہو تک ہی انتظار کرنا۔ نہ کوئی بڑے اڈے سے دستی رکشا پکڑ لیں گے۔"

چاروں تیار ہوئے اور چل دیے۔ چتر اور خرو نے کچھ سامان بھی ساتھ لے لیا۔ چلتے چلتے چتر نے یوم سے پوچھا۔

"تمہارے پاس پیسوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

یوم مسکرایا، "تمہیں پتا ہی ہے۔"

چتر نے خرو سے کہا "یار، تو ہی خان اسے تھوڑے دس روپے دے دے۔ میرا تیرا حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔"

خرو نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر یوم کو دے دیا۔ چتر نے یوم کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر راز داری کے انداز میں کہا "گھبرانا نہیں۔ کوئی یہاں رہے یا نہ رہے۔ مگر کیمپ کے آخر تک تم سب اسی طرح برابر کے شریک رہیں گے۔ خوب کھاؤ پیو۔ عیش کرو۔ بس ذرا حوصلہ رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حوصلہ رکھو۔ اس سفر میں تمہیں طرح سے بہت مرحلے ہوں گے۔ بہت پیسے ہیں بہت۔ ان ہماری جیبوں میں جو کچھ ہے وہ سب اپنا ہی ہے۔" لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے کو یوم سہارا دیے سیڑھیاں اتار رہا تھا۔ خجر اور زاغ بھی اتر گئے تھے۔

وہ چاروں میدان سے نکل تو سناٹا جو کہیں چھپا بیٹھا تھا، ہر چیز پر قابض ہو گیا۔ یوم نے خیمے کے مشرقی دروازے کے بھی دونوں پٹ کھول کر خیمے کی اطراف پر ڈال دیے۔ چیڑھ کے شمی نوکیلے درختوں کے سلاخوں جیسے باریک پتوں کے گچھوں کی چوٹیوں پہ سورج خاموش کھڑا چمک رہا تھا۔ اور ہر طرف بکھری مگر اداس گرمی انڈیل رہا تھا۔ دھوپ اپنی روشنی کے ساتھ اتنی ہی خاموشی اور اداسی لیے خیمے کے وسط تک اتر آئی۔ یوم کے کان سننے سکے۔ خوش باش چڑیوں کی چہچہاہٹ سننے کو ترس گئے تھے۔ وہ شاید پہاڑوں پر نہیں ہوتیں۔ اپنے گھر کا آنگن

اس کی آنکھوں میں گھوم گئی جہاں اس نے کبھی دیر تک پاس گھنی بیری کے درخت پر چھپی کوئل بہت مصروف معصوم چڑیوں کا جھنڈ گلی کے شوخ کھدرے بچوں کی مانند میں شور مچا رہا ہو کہ ایک تو کہیں سے زندہ ہو اور چیزوں کی ایک رنجی شاخ پا ن بیٹھا اس نے ایک رنج بانٹنی کانٹی کر اور بکائی پھر پھدک کر اسی رخ پھونچ بڑھا کے دو مرتبہ کاٹنی کاٹنی کی اور پھر مایوس سا ہو میں میرنا ہو کہیں چلا گیا اس کے اس اور اس جلد مایوس ہو کر جانے کی وجہ بوم کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

بوم نے چوریے سے پوچھا "آپ طبیعت کیسی ہے؟" کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اپنے چہرے پر بازو رکھے اسی طرح پہلو لیے بے حس و حرکت پڑی رہی جیسے سو رہی ہو اس نے کسی اور سے کیا کہ ہو اس کے بوم نے اس کے ہاتھ ہٹا کر دیکھا وہ رو رہی تھی۔ بوم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ دیا ہو۔ وہ تڑپ گیا "کیا بات ہو گئی؟ کہیں کوئی درد ہے؟ طبیعت زیادہ گھبرا رہی ہے؟"

"بس"

"اگر کچھ تو ہے تم رو کیوں رہی ہو؟"

مجھے اپنی جان پیاری رہی ہے بوم" وہ کسک سی کچھ پڑا اور بہت بڑا وہ اور کو جب بھی لپٹا وہ بے قابو ہو کر اس کے حلق اور ناک سے ابل پڑتی۔ پاس بیٹھے بوم نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر اور کمر پر ہاتھ پھیر کر دیر تک تسلی دیتا رہا۔ اس کی رشتہ اس کی بات سے کم ہو گیا بوم کوشش کے باوجود اسے کہنے کو کچھ نہ مل سکا۔

پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں بوم نہ چاہنے کے باوجود آہستہ آہستہ چوریے کی محبت میں پھنستا چلا گیا تھا جیسے سورج آہستہ آہستہ رات کی پھندے میں جا پھنستا ہے۔ جب وہ محبت اپنا ہونا ہو تو کون کہاں کا سکتا ہے کہ وہ رات کی چھاؤں میں ہے کر ہی گیا ہو جانے کا رات کے پھیلے سرور میں میرے پر غروب پہ کب سوچ سکتے ہیں کہ سحر بھی ہوتی ہے کر لی جانی گی کہ کچھ بالی نہ رہی کہ اس جذبے بے اختیار سے لڑتی لڑتی وہ اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اب کچھ اس کی اختیار میں نہ تھا۔ وہ جیرن رہ کہ جہاں تنہائی میں اتنی تاریک اور بیچ در بیچ بھول بھلیاں ہو سکتی ہیں جن میں وہ اکیلا اب ڈھونڈتا رہا ہے جہاں سرے سے کوئی راہ نہیں۔ عورت کا مرد سے عشق جسے وہ ہمیشہ ایک مضحکہ خیز صورت اور ابتذال کی انتہا سمجھتا تھا اس میں وہ خود گرفتار ہو جائے گا یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا؟ اس راز میں وہ کسی اور کو بھلا کیونکر شریک کر سکتا تھا جب اس کی اپنی شخصیت کا بھید اس تک اس سے منکر گیا؟ اس کی بارے میں سوچنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اندر ہی خوف اور اس کی ایک خول میں بند ہو گیا اسے پوری دنیا میں اپنی ذات بے معنی کچھ اچھا نہیں لگتا تھا سوائے چوریے کے قرب کے لیکن اس کے سامنے بھی وہ لب بند کیے گم بیٹھا رہتا۔ کبھی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اس سفر پر بھی اسی کی خاطر چلا آیا تھا۔ آج وہ اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ غیرت کو شک ہے تھا کہ بوم چوریے سے پیار کرتا ہے اسی لیے در سے بھی

عروج میں پر وا کوئی ہے کوئی بند پھندا سر اس کے پاس نہ برھتے ہوئے میں ملاپ پر کر دیتا ہوا" سو نکلا بھٹکت ہے کسی کو پتا نہیں چلتی ہے۔ ور بیچ ہی بیچ میں کام دکھا رہا تھا" یہ ہنس کر رہ جاتا۔

چوریے کی جدبات لفظوں میں بہہ چکی ہو سنبھالا جھجکیں۔ ہر دو ایسی کہانیں کے دوسری شب لگ میں جب بھی دس برس ہوں تو مجھے ماں یاد ہے بکتی ہے مجھے ان کے چہرے کا کوئی نقش بدن کا کوئی خط ہر سوں سے نکلا ہر کوئی یوں کچھ بھی تو یاد نہیں۔ لیکن وہ مجھے پھر بھی یاد ہیں ہے میرے اندر اس کے بچھڑ جانے کا دکھ بسا ہے اس کی چاہت کا احساس ہے۔ پتا نہیں اس نے مجھے پیار کیا بھی تھا یا نہیں لیکن مجھ میں اس کی چاہت کا احساس بنتی ہے کیا خبر یہ احساس ہی یہ میرے اندر جان کی طرح ہے لیکن ہمہ وقت میرے دل کے اس پاس گھومتا رہتا ہے مجھے بہت بھلا لگتا ہے لیکن جب یہ شدت سے ہو تو مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے میں کئی کئی دن گھبراہٹ سی میں ڈوبا رہتا ہوں۔ میں اس کی شدت سے گھبراتا ہوں اور دعائیں کرتا ہوں کہ یہ بس قائم رہے جاگ جب چپ کچھ دن گزر جانے دیں تو اس بلائے یہ مجبور بھی ہو جاتا ہوں بلکہ وہ خود ہی سب سے بڑھ کر اس وارد ہوتا ہے کچھ یاد نہ ہونے کے باوجود اس جب بھی خواب میں آتی ہے تو میں جھٹ پہچان جاتا ہوں کہ ماں ہے۔ خواب کیسی اچھی ہوتی ہیں کہ بالکل اور محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سے کبھی بچھڑا ہی نہیں۔ جیسے وہ کبھی مری ہو نہیں۔ ہم دونوں کبھی ہنستے رہے اور بعد تک کبھی لگ سے ہوں گے۔ آج صبح خواب میں ہی میں سفید کپڑے پہنا ہوا جوں (دوپٹہ) یوں سر کندھوں پہ پڑا تھا جیسے کام سے تھک کر اس ہو مجھ سے محبت پیار کیا۔ جانے لگی تو میں نے کہا ماں میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ پتا ہے کہنے لگی میں تو چاہتی تھی کہ تم یہیں ٹھہرے اگر اس نے کہا ہے تو چلو۔ میں نے اس کے ساتھ ایک پور قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ بوم یہ میری زندگی کی آخری دن ہے میں خوش ہوں کہ آج ماں کے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

بوم عجیب مخمصے میں تھا۔ جہاں ایک حوبیدہ خواہش چوریے کی خوبصورت بدن میں لپٹ جانے کی خواہش کے بوسے لینے کی صورت نکلی تو وہاں حالات ایسے تھے کہ چہرہ غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوبا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ چوریے کے جسم کے لمس سے اسے ایک سکون کا احساس تو تھا لیکن وہ چوریے کے شدید جذباتی ہیجان سے بھی اضطراب میں رہ سکتا تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ وہ اس کے دکھ میں زیادہ شریک ہے یا اس سے پیسے یہ زیادہ محظوظ ہے۔ دونوں میں بیک وقت ہی ہی جنگ اس کے ذہن میں مری سے چل رہی تھی۔ بوم نے اسے اور زیادہ لپٹ کر پتا کر اس کے سر یہ رکھ دیا۔ "میری جان کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا" اس نے معصوم چہرے سے گھبرا کے دو قطرے یوں ٹپک چوریا بتانے لگا "میں جب بھی اداس ہوتی ہوں تو امی کی قبر پہ چلا جاتا ہوں زبان بیٹھا رہتا ہوں اور روتا رہتا ہوں۔ کیسے گزر جاتے ہیں۔ جب طبیعت سنبھلتی ہے تو اٹھ کے گھر آ جاتا ہوں۔ ہارا مرنے والوں کے ساتھ کون مر سکتا ہے؟"

بوم نے بخار سے تپتے چوریے کو سینے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا اور سلجھی ادا کہ سر سے

خیر کے بستر پہ سیم دراز ہو گیا اور مطریں جورے کے چہرے پہ گاڑ دیں۔ میں نے پلکیں تھوڑی ور کانوں میں حلم، جیسے کسی نے سکین کی چہرے پہ انگوٹھے سے ہلکے ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا ہو۔ اوپر والے ہونٹ اور ٹھوڑی سے نیچے برمی سی میلی میلی ہلکی ہلکی فر۔ جیسے بکھرے سے بھرے بالوں کا جھنڈ۔ خالص کٹ خوبصورت ہے۔ نظر بھر کر دیکھنے سے ایک بار تو سانس رک جاتی ہے۔ لیکن جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی معصوم اور دکھی بھی۔ اس کا دل بری طرح چاہا کہ وہ سوتا رہے اور وہ بغیر اسے پتا چلے اس کے نازک، حساس ہونٹ صرف ایک بار چوم سکے۔

سیم نے جورے کو پہلی بار کالج کی اسٹیج پر ہیروئن کا پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سیم پر ہی کیا منحصر، اس وقت سارا کالج اس پہ عاشق ہو گیا۔ سیم بھی تھوڑے دنوں بعد سب بھول گیا۔ ڈرامہ چند دن چلا کر ختم ہو گیا لیکن شروع شروع میں عشاق کی بھرمار نے جورے کی ناک میں دم کر دیا۔ علاوہ کالج کے لڑکوں کے شہر کے دل پھینک بھی کبھی اس کی سائیکل پکڑ لیتے۔ کچھ جہاندیدہ قسم کے عشاق نے ہمہ وقتی باڈی گارڈ بننے کی پیش کش بھی کی۔ جب اس کی زندگی ہر طرح سے حرام ہو کر رہ گئی تو وہ ایک دن ہمت کر کے پرنسپل کے پیش ہو گیا اور اس سے تحفظ کا طالب ہوا۔ اس نے بجائے پولیس کو شکایت کرنے کے لیوسف کو بلو کے کہا کہ وہ جورے کی حفاظت کرے۔ اس نے قبول کر لیا اور دمیں ڈرامہ بھی ایسے ختم ہوا۔ یوسف خوب موت کی عاشقی کاھے گاھے جاتی رہتا۔ جو جورا اور ہم سب بخوبی سمجھتے تھے۔ سم عمر بھر میں صرف ایک ہی شعر یاد رہ سکا تھا جو اس نے کسی مرشکی وغیرہ میں کبھی سنا تھا اور بعض اوقات جورا جب ہم میں کسی کے ساتھ زیادہ بےتکلفی برتتا تو ازراہ تفنن پڑھتا:

ملنا جلنا رقیباں دا بند کر دے

میں تے مخملی ثغلا تیڈا پاڑ بھساں

یوسف کی منطق میں تو وہ آ گیا لیکن ہم سب کا دوست نہ بن سکا۔ شاید اس کی بڑی وجہ ہمارے اور اس کے درمیان سماجی اور معاشی تفاوت تھا۔ یا وہ ویسے ہی جھینپو اور کم گو تھا۔ یوسف سے ویسے ہر گھر پہنچا دیتا اور اس نے سب سے خوب سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی سے سنگ کرے تو بلاجھجھک بتا دے۔ مناسب انتظام ہو جائے گا۔ جب وہ روز یوسف کے ہمراہ سائیکل چلاتے ہوئے گھر جانے لگا تو ہر خاص و عام کو اطلاع ہو گئی کہ وہ یوسف کی پناہ میں ہے۔ اس لیے عام عاشق تو ویسے ہی چھٹ گئے۔ جورے کی کلاس میں ایک لڑکا تھا۔ بےحد غریب اور شاید کسی دور دراز گاؤں کا رہنے والا۔ اس نے میٹرک میں وظیفہ لیا تھا۔ اور سہرے مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا شہر کے کالج میں آ داخل ہوا۔ اور پیسے نہ ہونے کے باعث کسی رشتہ دار کے پاس شہر سے باہر کچہری میں ایک جھونپڑی کا کچا کوٹھا میں رہنے لگا۔ یوسف سے پہلے وہ جورے کو مقدور بھر تحفظ دیا کرتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ جورا مرے لوگوں سے رسم و راہ بڑھا رہا ہے، اور اس کی خدمات سے بےنیاز ہو گیا ہے، تو حسد سے جل اٹھا۔ ایک دن اس نے حسب سابق جورے کو پیش کش کی کہ "آؤ میں تمھاری سائیکل پہ تمھیں گھر پہنچا دوں اور آگے پیدل اپنی جھونپڑی کو چلا جاؤں گا" تو اس نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ انکار کرنے کے انداز میں غالباً کسی قدر رعونت اور بیزاری کا اظہار بھی شامل ہو گیا۔ وہ جورے کی زندگی سے چلا گیا تو پہلے ہی

کے سینے کے ساتھ کس لگائے بیٹھا تھا۔ اگرچہ آنسو تھم چکے تھے لیکن اس کی پلکیں ابھی تک اس کا چہرہ گیلا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ سیم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پہلے تو اسے خود یقین نہ آیا کہ وہ رو رہا ہے جب آنسوؤں کا دوسرا ریلا آیا تو یقین کرنا پڑا۔ پھر سسکیاں آنے لگیں۔ جورے نے حیرت سے پلٹ کر اس کے منہ کی طرف دیکھا "سیم تم رو رہے ہو؟ کیوں؟"

وہ کیا جواب دیتا؟ اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ ذہن میں ایک تواتر میں بکھرے ہوئے کئی وجوہ اس کے سامنے پیش کیں۔ وہ کسی کو بھی مناسب کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر سبھی اپنی اپنی جگہ درست معلوم ہوتی تھیں۔

وہ جورے کی ہمدردی میں رویا۔ خیر کی ناکامی پہ رویا۔ اپنی محبت کی ایک ناممکن العلاج دکھ بھری پہ رویا۔ عمر آخر تک سے تشنگی اور محرومی پہ رویا۔ تکمیل خواہش کی منتظر میں رویا۔ جورے پہ موت کی پرچھائیں پھیلی دیکھ کر رویا۔ پارہ صفت روح اسیر کی ہی مقدر پہ رویا جس نے اضطراب اور بےکلی کو ہر حال میں اس کا حصہ ٹھہرا دیا ہے۔ بےتاب وصل دائم کی حالت جدائی پہ رویا۔ اس کے آنسو تھم گئے جب جورے نے کہا "میں ٹھیک کیا ہوں۔ مجھے لٹا دو۔" اس نے نہایت آہستگی سے اس کے سہانے بوجھ کو بستر پہ لٹا دیا اور اپنے جورے کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ پاتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ بلامقصد لیوڈر کی لمبی قزلنگ درختوں کے جنگل میں، اداس دل اور مضمحل جان لیے صاف مہک ہو اور روشنی میں گھومتا رہا کہ کھردرے بھورے تنوں پہ ہاتھ پھیر پھیر کے دیکھتا۔ پھر سر اونچا کر کے ان کی پھیلی ہوئی بڑی بڑی چھتریوں پہ نظر دوڑاتا۔ کہیں کوئی کالی چڑیا نیلے آسمان کو گھورتی بیٹھی دکھائی دے جاتی۔ وہ چلتا ہوا اگلے درخت کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ درخت بس کھڑے ہی رہتے ہیں۔ نہ خوش، نہ غمگین۔ انسان اگر درخت ہوتا تو اس کی جنس نہ ہوتی۔ سو ہوا بند کی کھڑکی نہ رہتی دیتی۔ یا تو وہ مر جاتا، یا پھر چلتا۔ سورج درختوں کی چوٹیوں پر اب تک تھا اور بند ہو گیا تھا۔ فطرت کی یہ شدت سے چمکتی آنکھ نہایت سرعت سے کرنیں اگلے جا رہی تھی۔ اور اس کی خاکی آنکھوں میں کہاں یہ تاب تھی کہ اس چشمۂ نور سے ابلتی ہوئی شعاعوں کے سیلاب کو ایک بار بھی نظر بھر کے دیکھ سکیں۔ اسے علم تھا کہ ایک ایسی جرأت کا جواب وہاں سے عمر بھر کے اندھے پن کی صورت میں ملے گا۔ اس نے سوچا کہ سورج اگر سوا نیزے پر آ رکے تو کچھ اسے ہی بلند ہو گا یا اس سے کچھ کم۔ شاہ شمس نے جب اسے مچھلی بھوننے کے لیے طلب کیا تھا تو اور نیچا آن ٹھہرا ہو گا۔ کیونکہ یہاں سے تو مچھلی بھن نہیں سکتی۔ جورے سے عشق کا سورج بھی تو اب میری جان سے صرف سوا نیزے پہ آن ٹھہرا ہے۔ لگتا ہے یہ ابھی کچھ اور نیچے اتر کر تو مچھلی میں ہوں۔ اور وہ بھی مرنے جیسے بھوننے کے لیے یہ سوا نیزے پر آیا ہے جو کچھ دیر اور نہ بھنے تو دے جائے گی۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ جتنی جلد بھی سکے بھن جائے۔ ان سارے کہیں میں جب سورج مچھلی شاہ شمس، سیم، جورا، ایک ہی ذات میں مدغم ہو چکے تو پردہ گرنے کا ان بھول بھلیوں میں گم کچھ دیر پھرنے کے بعد وہ اپنے آپ سے ڈر کر بھاگا اور خیمے میں واپس آ گیا۔ جورا بخار سے سرخ چہرے تلے ہاتھ رکھے کمبل لیے سو رہا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم رکھتا جورے کے بالمقابل بیٹھے

پھنسو سے جھومتے ہوئے سر جھک کر [illegible] کی طرف [illegible] قریب ہوئے [illegible] کہا [illegible] منتظر میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا، "جہاں مولا دین کرم نوازیاں ہیں ساتھی۔"

بوم کو اس حادثہ قبیح کے بعد صحافی حافظ سے قابل قبول ہونے پر ذہنی دھچکا لگا۔ اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت اور بھر گئی۔

بوم پہلے ہی ایک جذبہ حدمت کے تحت [illegible] کو گھر سے [illegible] پھر [illegible] [illegible] [illegible] وہ گھوڑے دوست بن چکے تھے [illegible] [illegible] [illegible] جوڑا سے ویسے ہی [illegible] [illegible] [illegible] بوم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کہ وہ دوستی [illegible] [illegible] [illegible] لے جاتا اور اسے بجائے چوزوں سامنے بٹھائے رکھتا مگر کسی طرح سیری نہ ہوتی۔ اس قسم کی محبت سے اسے سخت نفرت تھی، اس لیے چوزے سے محبت کرنے کے تصور سے بھی بدکتا تھا۔ [illegible] بیٹے کی طرح اس نے اپنے دل کی کلی کے اندر قید کر رکھا تھا، اور خود بھی ساتھ ہی اندر بند تھا۔ اس نے اظہار کے ہر ذریعے پر پہرے بٹھا رکھے تھے پھر بھی اسے خطرہ رہتا کہ کوئی بھانپ نہ جائے۔

ویسے تو چوزے کے جاننے والوں سے شہر بھر تھا لیکن بوم ان سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتا تھا [illegible] [illegible] اس مقامی لڑکے کی طرح گشت کرنے کے لیے اکیلا رہ جاتا۔ ایک دن حسب معمول چوزہ اس کے [illegible] لگا۔"

"ٹھیک تھا۔"

"لڑکی بنے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی؟"

"رول کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کسی ڈرامے میں کچھ اور لڑکوں نے بھی عورتوں کے رول ادا کیے تھے" [illegible] [illegible] [illegible] بھی پوچھ ہی لیا۔ "میرو کیسی کیسا لگا؟"

[illegible] [illegible] [illegible] قریب جس سے

تھا۔ یوں ٹکار پہ بھڑک اٹھا اور چوزے کو مارنا شروع کر دیا اور اس بیدردی سے مارا کہ اس [illegible] چوزہ اس کے چنگل سے چھڑا لیا گیا تو کھدر کی شلوار قمیض والا سیدھا سادھا دیہاتی لڑکا ہاتھ پاؤں بلائے بغیر چوزے کی ہمدردوں کی مار کھاتا رہا اور اُف نہ کی اور اسی جگہ پہ بت بنا جم [illegible] لیا کہ اس نے چوزے کو مارا ہے اور اس لیے کہ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ چوزہ اسے چھوڑ کر [illegible] دن کے بعد وہ کسی نظر نہیں آیا۔ معلوم نہ کہاں گیا۔ اس واقعہ کے بعد چوزے کی عشاق کی رس سے ہمت ہی ختم ہو گئی۔ وہ سارے گروہ کا رکن تسلیم کیا جانے لگا۔ لیکن ہم نے اسے اس طرح بنایا جیسے کوئی لاوارث بچے کو رحم کھا کر اپنے پاس رکھ لے۔ غیرت نے چوزے کی حفاظت کی لیے بوم سے کہا "یارا یہ میرے راستے میں رہتا ہے۔ تو صبح کالج آتے ہوئے اسے گھر سے لے لیا کر۔ ایسا نہ ہو وہ پھر اس پر حملہ کرے۔ چند دن احتیاط کی ضرورت ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بوم ہر صبح چوزے کو لانے لگا دروازے پر آواز دیتا۔ وہ سائیکل لے کر نکلتا اور [illegible] روپ میں دیکھا ہو وہ اسے پسند آیا۔ اس کے اندر ایک جلتی ہوئی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ لڑکی ہوتا تو وہ جان کی بازی لگا دیتا لیکن اسے ہر صورت بھگا کر لے جاتا۔ لڑکی کا لڑکے سے عشق اس کی عقل و فہم سے باہر ایک چیستان تھا۔ اس کے دل میں اس جذبے کے خلاف نفرت ہی نہیں بلکہ حقارت تھی۔ ہاں، جنس مخالف کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کی توجہ کے لیے ترستا تھا لیکن اس کے بوسے گھر کا کوئی مکان نہ تھا۔ بوم مہاجر ہو کر اس شہر کے ریلوے اسٹیشن پر [illegible] [illegible] [illegible] سالم تانگہ کر لیا۔ کوچوان تیس پینتیس برس کا ایک سوکھا سڑا شخص تھا۔ سر پہ بڑا سا ڈھیلا ڈھالا پگڑ تھا اور قمیض تھی [illegible] آنکھیں غالباً [illegible] سے سرخ، وہ اگلی سیٹ پر بڑی شان سے نیم دراز تھا۔ اس کے ساتھ تانگے میں ایک چھوکرا تھا۔ عمر کوئی تیرہ چودہ برس۔ سرخ و سفید رنگ، وہ [illegible] شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ اس نے تیل سے چپڑے بال بائیں طرف مانگ نکال کر سنوارے ہوئے تھے۔ [illegible] لڑکا بہت شوخ تھا۔ کبھی راہ چلتے لوگوں پر اور کبھی دوسرے تانگے والوں پر آوازے کستا۔ کبھی گھوڑے کو چابک سے چھیڑ دیتا [illegible] پکڑا دیتا [illegible] [illegible] کوچوان [illegible] آنکھوں سے دیکھتا جاتا اور مسکراتا جاتا۔ کوچوان کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ راہ میں بھنگ کا ٹھیکا پڑتا تھا۔ لڑکا تانگہ روک کر اترا۔ ایک پیالا خود پیا، اور ایک کوچوان کو لا کر پلایا۔ [illegible] [illegible] کوچوان کو نشے میں مست آواز میں پکارا۔

"[illegible] [illegible] سوچتا چھوکرا [illegible] وہ ہیں؟"

سے مُر مُر کی آوازیں [illegible] رہی تھیں۔ کھانسی سے اس کی سانس پھول جاتی اور وہ نقاہت سے بے سدھ ہو کر گر پڑتا اور سانس بہت دیر تک ویسے ہی پھولی رہتی۔ ہوم نے پیار اور نرمی سے اس کا کندھا ہلا کر بیدار کیا۔ بخار سے مخمور اسٹیون جیراس نے کھول کر اس نے ہوم کو دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "میں نے تمہارے لیے مرغ کی یخنی بنوائی ہے۔ ایک پیالی لے لو۔ تم نے ناشتے میں بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"مجھے بھوک نہیں، تم کھاؤ۔" یہ کہہ کر کراہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہوم نے تھوڑا سا کچھ کی کہا، [illegible] تھا۔ اتنے میں فیرسٹ خیمے میں داخل ہوا۔ ایک ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ اور دوسرے میں پھلوں کی ٹوکری پکڑے ہوئے تھی۔ اس نے پوچھا "باقی سب کہاں ہیں؟" فیرسٹ کی آواز اور اس کر چہرے پر مسکراہٹ ہوا اور وہ بیٹھ گیا۔ جوزے نے پھولی ہوئی سانس سے بتایا، "وہ شکار کرنے گئے ہیں، رات کو لوٹیں گے۔"

ہوم نے اصلاح کی، "آج [illegible] اور جعفر ہو لوٹ آئیں گے لیکن پیٹر اور خوجے رات ہینٹر کیمپ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔"

"اچھا تو یہ ٹھہرتے ہیں۔ [illegible] لیکن ہوم، میری صورت پر آج اتنی زیادہ نحوست کیوں برس رہی ہے؟ جوزے سارا دن بیچ رہے ہیں اور تو ابھی تک پر سو رہا ہے۔ تو یہاں سیر کرنے آیا ہے کہ سونے کے لیے آیا ہے؟"

ہوم نے بتایا "اسے شدید بخار اور کھانسی زکام ہو رہا ہے۔ رات بارش میں بھیگ گئے تھے اور تو ٹھیک رہا، اسے بخار ہو گیا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ تیتیوں تاپ چڑھے میں ہونگا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ کھانسی زکام کوئی سی بیماری ہے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔ ہوم تو بالکل نہ گھبرا۔ جوزے کا میں ذمے دار ہوں۔"

اس مرجھائی چھائے خیمے میں فیرسٹ کے آنے سے رونق آ گئی۔ بیمار اور تیمارداری ہونے کھڑا اٹھے فیرسٹ نے بستر پر بیٹھ کر جوزے کو گود میں لے لیا۔ "او میری جان، میں تیرے قربان، تو کیوں بیمار ہو گیا؟ کاش میری جگہ مجھے بخار ہو جاتا۔" لے یہ مٹھائی کھا۔ اس نے لفافہ کھول کر برفی کی بڑی سی ڈلی اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ ہوم نے پوچھا، "رات کیسی گزری؟ تمہاری تو بہت بری گزری۔"

"کیوں، اس کی بیماری سے؟"

"نہیں، پیٹر کی ضرورت سے زیادہ چالاکی نے مروا دیا۔ کیمپ لگ پہاڑی کے بیچ میں سے ہٹ چلے ہوں۔ فاصلہ ادھر سے بھی کم پڑے گا۔ بہت بری ہوئی۔ خرجیسے کھڈ میں جا گرا اور پوڑی میں موچ آئی۔ راستا بھولے، بارش میں بھیگے، کیا کچھ نہیں ہوا۔ صبح دو ڈھائی بجے یہاں پہنچے۔"

"تمہاری تو بہت مزے میں گزری۔ صبح سی بجے تک مجرا ہوا اور شراب چلی۔ حسینہ اور مسعودہ گانے گاتے اور ناچتے ناچتے ندھال ہو گئیں۔ آخر [illegible] اور [illegible] اور پاؤں اٹھانے کی سکت نہ رہی۔ سازندے الگ تھکے ہارے۔ جماہیاں لے لے کر بدحال ہو رہے تھے۔ مہمان رخصت

میں چاہتا کہ کاش یہ سچ ہوتی۔"

یہ عجیب سا جواب سن کر ہوم کا چہرہ اتر گیا اور وہ افسردہ ہو گیا۔ یہ وہ جواب تو نہ تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی اور جوزے [illegible] ہوتے ہوئے ایک ہلکی سی کرن کی دھاگی سے اس کا دل [illegible] ہوئے اس نے [illegible] پوچھ ہی لیا کہ یہ تو یہ مت کی کوئی بھی حد ہوتی یا پھر سب وسوسے صاف ہو جاتی۔ "وہ لڑکا جو تمہیں ملا تھا اس نے کبھی تمہیں ملنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"اس نے کبھی اپنا حق تم پہ نہیں جتایا؟"

"نہیں، مگر کیسا حق؟" یہ سن کر ہوم کچھ اٹھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا، "میرا مطلب تھا [illegible] وہ مرد تھا نہ۔ [illegible] صبح پر [illegible] محبت میں ڈائیلاگ جو بولتا تھا۔" موضوع [illegible] کو اپنے ساتھ ہی [illegible] جوزے تمہیں کبھی کسی لڑکی نے نہیں لبھایا؟"

"نہیں۔ مجھے [illegible] جو [illegible] تم لوگ یہ نہیں کہو گے کہ مجھے [illegible] ہوئے پھرتی ہوئی زرد اداس چہرے سامنے آتی ہیں، ہراساں، چور نظروں سے تکتی ہوئی، ایک [illegible] کہ ہم [illegible] گم ہو جاتے ہیں۔ [illegible] اس میں سطحی [illegible] جیسے کہ رہی ہوں کہ ہمیں کہیں نہ جانا، کسی پناہ کی نہیں۔ [illegible] کو کوٹھوں پر سجائی رہتی ہیں، جیسے اپنی [illegible] کی مصنوعات کی سیمپل دکھا رہی ہوں۔"

[illegible] کے پاس وہ دونوں بیٹھے ٹھہرے تھے تو ہوم نے اس کی بات [illegible] ہوئے پوچھا: [illegible] ہو تم نے بہت سی صحبت مند چہروں والی لڑکیاں دیکھی ہیں اور [illegible] تو ابھی بہت قریب سے دیکھ کر آ رہے ہو ان کے بارے میں تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی ہے؟"

"یہ چھوڑو یار، سب ایک سی ہوتی ہیں بے وقوف۔ مچھلی کی طرح۔"

"میں ایسی بھی کیا بات ہے۔"

"میں [illegible] مجھ کو [illegible] انگریزی گرامر میں shall اور will کے استعمال کی طرح مجھے کبھی ان کی گرامر بھی سمجھ میں نہ آ سکی۔ پتا نہیں کب ان کی ہاں کا مطلب نہ ہوتا ہے اور نہ کا مطلب ہاں ہوتا ہے اور کب ہاں کا مطلب ہاں اور نہ کا مطلب نہ ہوتا ہے۔ [illegible] چاہتی ہیں [illegible] نہیں چاہتیں [illegible] چاہتی ہیں [illegible] چاہتیں، جانتا بھی چاہتی ہیں اور نہیں بھی جتنا چاہتیں، کچھ عجیب سا چکر ہے ان کا۔"

نوکر خیمے کے اندر آیا، "صاحب کھانا تیار ہے۔" ہوم نے کہا، "لے آؤ۔"

صبح سے اب تک تو بڑی مرتبہ جوزے نے اس سے پانی مانگا جو اس نے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے اسے پلایا۔ وقفے وقفے سے اسے کھانسی کا دورہ پڑتا اور وہ اسے سنبھالتا۔ ہر مرتبہ جب اس نے جوزے کی شدید بخار سے تپتے بدن کو چھوا تو ہاتھوں کے لمس سے جوزے بدن کو [illegible] تھا۔ جوزے پر بخار کی نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی تو ہر بات پر [illegible] رہے۔ اس کی چھاتی

شریف جمیلہ بیگم گلزار رشید خاں کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئی، اور سعیدہ کو میں اپنے [illegible] کو بھی جائے۔"

بوم نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن کو مجھے سعیدہ کا جو حسن ہو سو ہو لیکن اس کی ایک خوبی جانتا ہوں کہ اس نے تم جیسے اجڈ کو رات رات میں شاعر بنا دیا۔"

یوسف نے قہقہہ لگایا۔ "ارے کہاں، یہ فقرہ تو طاں رات نشے میں جھونک میں بار بار کہہ رہا تھا تاکہ وہ کچھ اثر کر سکے۔ ویسے وہ بھی کہاں کا شاعر ہے اس نے کسی اور سے کبھی سنا ہوگا۔ اچھا، تو میں بتا رہا تھا کہ میں اور سعیدہ صبح آٹھ بجے تک جاگتے رہے میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ پھر بھی بولے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے سونے پر آمادہ کیا۔ ایسی باتیں اتنی دلچسپ کرتی ہے کہ جی چاہتا ہے وہ سنتی رہے، وہ آدمی سنتا رہے۔ بات سے بات پیدا کرتی ہے [illegible] اچھا گھوڑا ہے میں اب اس پر واپس لوٹ جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوزے کے گالوں کو تھپتھپایا [illegible] ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک ہے۔ بل میں دوں گا۔"

جاتے جاتے مڑ کے بولا۔ "اوئے چوزے، اس بوم سے بچ کے رہنا۔ [illegible]"

دن ڈھل گیا اور شام ہو گئی۔ نوکر نے لالٹین صاف کر کے تیل بھرا اور خیمے کی چھت سے لٹکا دی۔ [illegible] کہہ کر گھر جانے کی اجازت چاہی [illegible] کہیں دور پیچھے سے [illegible] کے متعلق [illegible] چوزے سے کہیں [illegible] کو وہ پہلا شخص ہے جو محسوس کر کے انشا کر رہا ہو۔

"چوزے!"

"ہاں؟"

"ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گے؟"

"کہو"

"مجھے تم سے بے حد پیار ہو گیا ہے۔ [illegible] پھر بھی میں نہیں جانتا گوری۔"

"میں جانتا ہوں گوری، ایک شب صحرا تھا جیسا کہ ایک تنہا صحرا ہوتا ہے، ایک تنہا سورج تھا جیسا کہ یہ سورج [illegible] وسط میں دو مسافر تھے جیسے کہ ہم دو مسافر ہیں۔ اور بس۔"

"اور بس؟"

"ہاں اور بس۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بخار سے جلتا ہوا گرم ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھوا۔ بوم نے اس ہاتھ کو اپنے گال پر ہاتھ سے دبا لیا پھر اسے چوما اور سینے سے لگا لیا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے گم سم خاموش۔ بوم کے دل کی دھڑکنیں چوزے کے ہاتھ کی ڈوریں اس میں جذب [illegible] کے اندر جھانکی کی اور لوٹ جانے کی۔"

چوزے کو بخار کی غنودگی نے ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں، اور بوجھل بوجھل سانس [illegible] پھرا جھنجھلا رہا تھا۔ بوم نے سوچا، اس منطقی میں بھی ایک ظلم ہو گا جسے وہ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ کیا سمجھ سکا ہے؟ کچھ بھی نہیں سمجھا [illegible] بیٹھے ابھی جو کچھ گزرا اس پہ وہ نہ تو پشیمان تھا نہ متاسف، نہ خوش نہ مسرور، بس حیران تھا [illegible] محبت کیا اور چوزے نے اسے قبول کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اسے دھتکار دیتا [illegible] شعلہ جیتا ساتھی تھا۔ وہ خوف اور مایوسی سے بھرا انسان۔ کیا وہ دونوں فطرت کے کسی تلون کا شکار ہیں؟ [illegible] پیدا کیے گئے ہیں؟ اس نے اپنا موازنہ تانگے والے سے کیا تو خود کو بہت بزدل پایا۔ اس نے جان [illegible] پھر اس پر ندامت ہوئی کہ وہ گھٹیا شخص جو کچھ بھی ہے، وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس [illegible]

Scanned with CamScanner

سے بالاتر اور ہماری نظروں سے مخفی ہیں لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بدمعاش صورت کی شدت ہو جس نے مجبور ہو کر یہ رخ اختیار کر لیا ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ شہر واپس پہنچ کر وصیوں کے پاس جائے گا۔ کسی دور سک مسافروں پہ جذبہ اگر پھر بھی اسی طرح موجود رہا سے تو وہ حقیقت کہہ دے گا اور یہ حق میں دب گئے فضرت کی غلط فیصلہ کو تسلیم کر لے گا۔ وہ علامہ دماغ سی ذہن میں بیٹھا تھا کہ سامنے سے کوئی مسافر چہرہ کی تاب دکھائی دیا۔ اس نے کہیں کی آواز دی "کون ہو؟"

"ارے یار، خنجر ہوں اور کون ہوں۔"

"اوہ اچھا!" کہتے ہوئے وہ حال میں واپس آ گیا۔ "آگئے! رہے ہو زاغ کہاں ہے؟"

"وہ تل شہر گیا ہے وہ بس میں بیٹھے شہر جاتا ہی ہے کسی رشتہ دار سے مل کر جب کل سے قسمی کو کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا ہے۔"

"کب پہنچا ہو گا؟"

"تو ہم رہے ہیں، چوزے کا کیا حال ہے؟"

"ویسا ہی ہے، ہم اپنی سستاؤ۔ اور اندر چلتے ہیں۔"

خنجر سامنے بیٹھ "یار آج بڑا کام تھا اور ساتھی اور جوجی اس نے نہیں۔ وہاں دیر سے میں بیٹھی ہم سب باتیں کرتی رہیں۔ کل شام ان کا وعدہ کر گئی ہیں۔ اسی لیے زاغ ہوٹل میں کمرہ لینا چاہتا ہے۔"

چوزہ جاگ رہا تھا، اور کراہ رہا تھا۔ اس کی سانس پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو رہی تھی۔

"بوم! تم کہاں چلے گئے تھے؟ میرے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہے۔"

"ہم سو رہے تھے، میں یہیں باہر پتھر پر بیٹھا تھا۔ آواز دی ہوتی۔"

"مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔"

انہوں نے پیچھے تکیے لگا کر بٹھا دیا۔ "ہاں اس طرح سانس کچھ بہتر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اسے کھانسی کا دورہ اٹھا اور سرخ سرخ خون کا بڑا سا لوتھڑا کمبل پہ آ رہا۔ یہ دیکھ کر تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

کمبل بدلا گیا۔ بوم نے الگ لے جا کر خنجر کے کان میں کہا "خنجر ابھی قدموں سے فوراً واپس قصبے لوٹ جاؤ۔ ہوٹل کا گیسٹ ہاؤس آسانی سے مل جائے گا۔ چترا اور حنا کو ساتھ لے کر فیروزت کو تلاش کرنا مشکل نہ ہو گا۔ وہ رشید خان نامی شخص کے بنگلے پر ہیں۔ اس کی حالت بتا کر رشید خان کی کار پر ڈاکٹر کو لے آ یا اسے ہسپتال منتقل کرنے کا انتظام کرو۔ جلدی میں جانتا ہوں اسے کیا ہو گیا ہے۔ خطرہ ہے، کوشش نہ کرنا۔" خنجر قصبے کی سمت دوڑ پڑا۔

اس نے سے دو کمبل اڑھا دیے اور موم بتی اس کے منہ کے سامنے پھیلا دی۔ چوزے کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور چہرہ زرد تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اسے ایک ایک سانس کھینچنے کے لیے زور لگانا پڑ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ "بوم ہاتھ میرے سینے پر رکھ دو۔ درد ہے۔ لگتا ہے ماں کے پیار میں تجھ سے زیادہ کشش ہے۔" اب کی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب کی

اس کی آواز میں نقاہت غالب تھی۔

"چوزے، ایسی باتیں نہ کرو۔ خنجر ابھی ڈاکٹر کو لے کر آ جائے گا۔ ہمت نہ ہارو۔ تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔" اس نے بند آنکھوں سے اثبات میں ذرا سی گردن ہلائی۔ ہر سانس کھینچنے کے لیے چوزے کو گردن اٹھا کر زور لگانا پڑتا۔ یہ عذاب دیکھتے ہوئے اس کی ہر سانس کے ساتھ بوم کی بس بس سے جان نکلتی۔ وہ اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ وہ دعا کر رہا تھا "یا خدا اس کو صحت دے یا مجھے بھی ساتھ اٹھا لے۔" چوزے نے آنکھیں کھولیں۔ بوم نے چہرہ ایک طرف کر کے آنسو پونچھے اور پاس بیٹھ گیا۔

"چوزے، کیا بات ہے؟ خدا کرے اب ٹھیک ہو جاؤ۔ اور کچھ نہیں تو اپنی سانس تو ٹھیک کر لو۔ اللہ کچھ تو کرو۔ ایسے کیسے ہو گا"

"اللہ میرے اچھے لگتے ہیں۔ نازک نازک سے۔"

اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ منہ خون سے بھر گیا۔ گردن تکیوں پر ڈھلک گئی۔ دو تین اکھڑی اکھڑی سانسیں آئیں، اور پھر ختم۔

چوزے کے سامنے بوم یوں حواس باختہ آنکھیں پھاڑے ہیبت زدہ کھڑا تھا جیسے چوزے کی موت نے اس کی ہر حس ہر تاثر ہر احساس کو ہانک ہوئے ان بے زبانوں کی طرح ہانک کر شکاری کی جیپ کی تیز روشنی کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا ہو۔

چوزہ سفید چادروں میں لپٹا ایمبولینس کے بیڈ پر نعش کی طرح سیدھا لیٹا تھا اور بوم اس کے قریب سیٹ پر حواس گم بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے ذرا رک کر ہارن دیا اور ایمبولینس چل پڑی۔ اس کے پیچھے رشید خان کی بڑی کار جس میں باقی پانچ ساتھی بہ چشم نم معصوم اور اداس بیٹھے تھے۔ وہ بڑی بوم سے انہوں نے کہا کہ وہ بھی کار میں جانے لگی وہ نہ مانا۔ پہاڑی راستہ ختم ہو گا کہ ایک بڑی سی کار پیچھے سے آئی اور آگے نکل گئی جس میں جوجی اور سیمی کچھ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ دونوں نے ہاتھ باہر نکال کر ویو کیا۔ جوجی نے تو چلتے کی دیکھا بھی، اور بڑی سی مسکراہٹ پھینکی۔ چترا نے آنسو بھری آنکھوں کے باوجود ہیلو کرتے ہوئے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟"

زاغ نے بھی زبان میں بتایا "میری اور خنجر کی دوست ہیں۔"

خوبصورت اور غیرت بھی رونا بھول کر ہشیار ہوئے۔ اتنے میں وہ کار ایمبولینس سے آگے نکل چکی تھی، جس میں دو مُردے اپنی منزل کی طرف رواں تھے اور اس کار میں زندہ لوگ، کشمکش حیات میں پوری طرح لتھڑے اپنی اپنی مسرتوں کی تلاش میں رواں تھے۔ اگرچہ بظاہر لاشیں لے جانے والی ایمبولینس کی پیچھے جا رہی تھی۔

سالانہ خریداری

چار شماروں کی قیمت : سو روپے

آج

خزاں ۱۹۸۹

تارا شنکر بنرجی
سیتہ جیت رے
اسد محمد خاں
محمد خالد اختر
ڈونلڈ بارتھیم
ولیم سیرویان
افضال احمد سید
ذی شان ساحل
نسرین انجم بھٹی
سعید الدین
ثیر مسعود
فروغ فرخ زاد
بابا مقدم

قیمت : پچیس روپے
مکتبۂ دانیال سے طلب کیجیے

آج کی کتابیں

آج : پہلی کتاب	ترتیب : اجمل کمال	قیمت : ۱۲۰ روپے
پچھلی ہوش تاریخ (نظمیں)	افضال احمد سید	قیمت : ۲۰۰ روپے
بوفِ کور (ناول)	صادق ہدایت	قیمت : ۱۵۰ روپے
بارہ ہندوستانی شاعر	ترتیب : اجمل کمال	قیمت : ۲۱۰ روپے
خیمۂ سیاہ (غزلیں)	افضال احمد سید	قیمت : ۳۰۰ روپے
آوارگی (منتخب تراجم)	محمد عمر میمن	قیمت : ۲۰۰ روپے
آج : دوسری کتاب	ترتیب : اجمل کمال	قیمت : ۲۴۰ روپے

تقسیم کار : مکتبۂ دانیال

rekhta

ذی شان ساحل
کی نظموں کا مجموعہ
چڑیوں کا شور
قیمت: چالیس روپے

افضال احمد سیّد
کی نظموں کا مجموعہ
دو زبانوں میں سزائے موت
قیمت: پچاس روپے

آج کی کتابیں
تقسیم کار: مکتبۂ دانیال

Scanned with CamScanner

پاکستان اسٹیل
راہِ ترقی پر گامزن

اجتماعی کارکردگی کے ذریعے
بلند ترین نصب العین کا حصول
پاکستان کے سب سے بڑے
صنعتی ادارے کا مطمحِ نظر ہے

پاکستان اسٹیل

With the compliments of

INTERNATIONAL INDUSTRIES LTD

Manufacturers of:
- Galvanised Pipes
- Steel Tubes
- Cold - rolled steel

and Electrical Contractors

آج

بہار ۱۹۹۰

محمد عمر میمن

امین مالوف

جیک لنڈن

اوکتاویو پاز

وجے دان دیتھا

کہانیاں

محمد سلیم الرحمٰن

نامکمل ناول کے اوراق

محمد انور خالد

زیبا الیاس

نظمیں

انتخاب

پولینڈ کے چار شاعر

تادیوش روزے وچ

زبگنیو ہربرٹ

الیگزانڈر واٹ اور

واسلاوا شمبورسکا

نظموں کا انتخاب

اور بہت سی متنوع تحریریں

مارچ ۱۹۹۰ میں شائع ہو گا

آج کی کتابیں

تقسیم کار

مکتبۂ دانیال

rekhta

Scanned with CamScanner